ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس لکھنوی، کراچی پاکستان

تمہید

برصغیر کے شیعہ اپنے مذہب اور اپنی قوم کی تاریخ سے بے خبر ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ہندوستان میں ان کی قومی اور مذہبی حیثیت کیا تھی اور کس طرح وہ اپنے عقائد سے واقف ہوئے اور دوسروں کے عقائد ترک کئے، ان کی قومی تشکیل کس طرح ہوئی۔ اس کو جاننا، اس کی یادگار منانا اور انھیں طریقوں پر عامل ہوجانا ضروری ہے جن سے وہ ایک قوم بنے۔ ہم نے اس روئداد کو مختصر طور پر پیش کرنا ضروری سمجھا کہ شیعہ اپنے مذہب کی تاریخ سے واقف ہوجائیں۔ اگرچہ ہماری یہ کوشش مختصر ہے مگر سمجھنے اور یاد رکھنے کے لئے کافی ہے۔

یہ واقعہ عہد آصف الدولہ کا ہے۔ اگرچہ اس میں اُن کی سعی کو کچھ دخل نہیں مگر ان کے عہد کا واقعہ ہے جو مولانا دلدار علی غفران مآبؒ کی سعیٔ پیہم اور نواب حسن رضا خاں کی سرپرستی سے وجود میں آیا۔ مورّخوں اور تذکرہ نویسوں نے غفران مآبؒ کی کوششوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے مگر نواب حسن رضا خاں کو نظر انداز کردیا ہے۔ یہ بڑی حق تلفی کی بات ہے۔ اس کو بھی تفصیل سے بیان کرنا تاریخی دیانت کے لحاظ سے ضروری تھا۔ اس کمی کو میں نے پورا کردیا ہے۔

فقط: ذرۂ ناچیز
محمد باقر شمسؔ

تیرھویں صدی ہجری
عہد آصف الدولہ میں شیعت کی تجدید
مولانا دلدار علی غفران مآب علیہ الرحمہ اور
سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے شیعہ اپنے کو ظاہر نہیں کرسکتے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ فیروزشاہ کے زمانہ میں کچھ رافضی اوران کی کتابیں پکڑی گئیں، کتابیں سرِ بازار جلادی گئیں اور رافضیوں کو اس جگہ پہنچادیا گیا جو ان کے لئے مقدر تھی۔ نقوی سادات کا ایک خاندان محمود غزنوی کے وقت سے جائس میں آباد تھا جو تلوئی، سمرن گڑھ، سیواڑہ، رسالپور، پٹاک پور اور امیٹھی ہندو ریاستوں کے بیچ میں تھا۔ یہ ریاستیں اس وقت حکومت دہلی سے آزاد اور خودمختار تھیں اس وجہ سے جائس کے سادات محفوظ رہے۔

مغل حکومت اور شیعہ

بابر کے ساتھ شیعہ ہندوستان میں آئے اور امراء کی صف میں داخل ہوئے، پھر ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہوگیا اور ان کی تعداد بڑھتی رہی، مگر بحیثیت جماعت ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ اہل سنت کے ساتھ شادی بیاہ کرتے تھے اور ان کے تمام مذہبی رواسم بجالاتے تھے کیوں کہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا نکاح، طلاق، نماز، روزہ، دفن وکفن سب اہل سنت کے طریقہ پر انھیں کے ہاتھوں سے انجام پاتا تھا۔ پیری، مریدی، عرس، قوالی، چادر، گاگر، شیخ سدّو کا بکرا، میراں جی کے گلگلے، احمد کبیر کی گائے، سید سالار کا جھنڈا۔ مدار صاحب کی کندوری، بڑے پیر کا فاتحہ

اہلسنت میں عام تھی، شیعہ بھی اس میں ان کے برابر کے شریک ہو گئے۔ ان حالات میں باہر سے آنے والے شیعہ تو شیعہ رہے مگر ان کی اولاد رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے بے خبر اور عام مسلمانوں میں جذب ہوتی چلی گئی۔ سفر کی دشواری اور رسل ورسائل کے فقدان نے عراق سے کوئی ربط قائم نہ ہونے دیا۔

ایران سے صرف ادبی رشتہ تھا اور شیعیت کا ایک دھندلا سا نقش پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ میں رہ گیا تھا۔ شیعہ عوام کو اتنا شعور بھی نہ تھا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ خوف، کچھ مروت سے کچھ قرابت داری، کچھ اپنی قلتِ تعداد کو محسوس کر کے اپنے مذہب سے بے اعتنائی برتنے لگے اور کچھ جان بوجھ کے چھپانے لگے۔ ''تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلماء'' میں مولانا محمد حسین صاحب نوگانوی نے لکھا ہے کہ قاضی نوراللہ شوستریؒ زندگی بھر اپنے مذہب کو چھپاتے رہے، اس طرح ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ خاندان کے خاندان سنی ہوتے چلے گئے۔ جب شیعوں کی آزاد ریاستیں قائم ہو گئیں تو ان میں یہی حالت رہی کیوں کہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا۔ علمائے اہلسنت ہی مفتی وقاضی اور امام جمعہ وجماعت تھے۔ سنیوں اور شیعوں کے تمام مذہبی امور انھیں کے ہاتھوں انجام پاتے تھے، صرف اودھ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ فیض آباد میں مولانا رجب علی اور جونپور میں مولانا سید عسکری صاحب شیعہ عالم تھے، پانچ سنی عالم اپنی ذاتی تحقیق سے شیعہ ہو گئے۔ ملا حمد اللہ، علی اکبر چشتی مودودی، تفضّل حسین خانِ علامہ، مولوی شمس الدین فقیر اور میر قمرالدین منتؔ۔

ملّا حمد اللہ منطقی آدمی تھے۔ شیعہ ہونے کے بعد انھوں نے علامہ بہائی کی زبدۃ الاصول کی شرح لکھی۔

مولانا اکبر علی چشتی مودودی نے خرقۂ خلافت اتار دیا اور پیری مریدی چھوڑ دی۔

تفضّل حسین خانِ علامہ فلسفی تھے۔ انھوں نے فلسفہ میں کتابیں لکھیں۔ سفارت تک پہنچنے کے بعد بھی وہ درس دیا کرتے تھے۔ وہ معقولات کے ساتھ اہل سنت کو سنی فقہ اور شیعوں کو شیعہ فقہ بھی پڑھاتے تھے۔ میر شمس الدین فقیؔر اور میر قمرالدین منتؔ ادیب تھے۔ ان لوگوں کی شیعیت کا اثر ان کے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ لکھنؤ میں شیعیت کا اثر صرف اتنا تھا کہ یہاں کے پہلے فرماں روا برہان الملک نے محرم میں مجلس قائم کی جس میں مرثیہ پڑھا جاتا تھا مگر صرف دس دن باقی دنوں میں مذہبی رواسم وہی صوفیاء کی نذر ونیاز تھے۔ برہان الملک کے جانشین صفدر جنگ کے زمانہ میں عزاداری کو کوئی ترقی نہیں ہوئی کیوں کہ وہ زیادہ تر دہلی میں رہے۔ شجاع الدولہ کو عزاداری سے بہت عقیدت تھی۔ وہ محرم کے دس دن بڑی دھوم سے عزاداری کرتے تھے۔ اودھ میں صرف جائس ونصیر آباد ایسا خطہ تھا جہاں شیعہ سادات بہت دن سے آباد تھے۔ ان میں علماء وفضلاء بھی پیدا ہوتے رہے یہ لوگ اپنے مذہب سے باخبر تھے اورنگزیب کے زمانہ سے ان کو قضا اور معلمی کے عہدے بھی ملتے رہے۔ غفران مآبؒ کے بزرگوں میں سید عبدالقادر اورنگزیب کے بڑے بیٹے کے استاد تھے جن کی تعلیم سے وہ شیعہ ہوئے اور بہادر شاہ بننے کے بعد انھوں نے اپنی شیعیت کا اعلان کر دیا جس پر ہنگامہ برپا ہوا تفصیلات تاریخ میں موجود ہیں۔ آخر زمانہ میں ملا نعمت اللہ، ملا عصمت اللہ، قاضی قربان علی، قاضی علی رضا اور قاضی عادل حسین یہاں کے مشہور عالم تھے۔ اپنی سیادت کو محفوظ رکھنے کے لئے آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے تھے۔ سنی وہ سب کرتے تھے جو ہندوستان میں ہوتا تھا۔ شیعوں میں صوفیوں کی نذر ونیاز جائز نہیں ہوتی تھی۔ اس خطہ کے علاوہ سارے ہندوستان میں شیعیت کی زبوں حالی حساس دلوں کو پکارتی تھی مگر کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا اسی سادات نصیر آباد وجائس کے فرزند رشید دلدار علی ۱۱۶۶ھ کو شب جمعہ نصیر آباد میں پیدا ہوئے۔ قدرت نے ان کو حساس دل، دقیق نظر، انقلابی ذہن، آہنی عزم اور پرتاثیر زبان عطا کی تھی۔ وہ بچپنے سے بردبار، سنجیدہ اور غور وفکر کے عادی تھے اور شیعیت کی اس زبوں حالی پر غور کرتے رہتے تھے۔ دیہات کی زندگی، کھیتی باڑی کا مشغلہ تھا اور معمولی تعلیم تھی۔ تاریخ وسیر کی کتابوں میں لکھا ہے

کہ ایک دن وہ اپنے کھیتوں کے قریب، درخت کے نیچے کھڑے تھے کہ ایک روشنی پیدا ہوئی اور آواز آئی ''دلدار علی جا! اور علم دین حاصل کر'' حقیقت میں یہ ان کے دل کی آواز تھی جسے وہ سوتے جاگتے سنا کرتے تھے۔

گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور ہندوستان کے مشہور علماء سے فلسفہ، منطق، ہیئت اور ریاضی میں وہ تبحر پیدا کیا کہ علامہ ''عبدالحیٔ فرنگی محلی'' جو اپنے وقت کے مشہور فلسفی تھے ان کا یہ قول ان کے شاگرد سید مرتضیٰ فلسفی نے ''معراج العقول'' میں لکھا ہے کہ جب میں جناب غفران مآب کے حاشیہ صدرا کو دیکھتا ہوں تو متاخرین فلاسفہ پر ان کو ترجیح دیتا ہوں۔

ان کے بیٹے سلطان العلماء سید محمدؒ صاحب رضوان مآب کی مشہور کتاب ''بوارق موبقہ'' سے انکشاف ہوا کہ جناب غفران مآبؒ نے تکمیل علوم کے بعد ہندوستان کی سیاحت بھی کی اور مشہور علماء سے مباحثے بھی کئے۔ شاہ جہاں پور کی مسجد میں ملّا ''عبدالعلی فرنگی محلی'' سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی کتاب ''شرح سلّم'' میں ملا حمد اللہ پر جو اعتراض کئے تھے ان کا جواب غفران مآبؒ نے دیا تو وہ کوئی شافی جواب نہ دے سکے۔ دہلی کی جامع مسجد میں ملا حسن سے مسئلہ انجراء وتر پر بحث ہوئی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ علم میں یہ درجہ حاصل کرنے کے بعد وہ لکھنؤ آئے۔ اس وقت آصف الدولہ حکمران اور حسن رضا خاں سرفراز الدولہ وزیر اعظم تھے، ان کے بیٹوں کے استاد سے غفرانمآبؒ نے ربط پیدا کیا، پھر انھیں کے ذریعہ سے وزیر اعظم سے ملے اور ان سے کہا کہ شیعہ ریاست میں عیدین اور جمعہ کی نمازیں اہل سنت پڑھاتے ہیں، سنی علماء مفتی اور قاضی ہیں، نکاح، طلاق، دفن کفن شیعوں کا بھی سُنی طریقہ سے ہوتا ہے۔ پیری مریدی، عرس، قوالی اور صوفیوں کی نذر و نیاز شیعوں نے اختیار کر لی ہے اور اپنے مذہب سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ صرف تعزیہ داری جانتے ہیں، وہ بھی اصلاح طلب ہے۔ ان میں تبلیغ کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے مذہب سے واقف ہوں۔ لوگوں کو دینی تعلیم کی طرف راغب کیا جائے۔ فقہ و اصول اور کلام و مناظرہ کی کتابیں پڑھائی جائیں اور علماء و مبلغین پیدا کئے جائیں۔ حسن رضا خاں دین دار آدمی تھے، انھوں نے کہا: '' آپ یہ امور انجام دیں۔ میں آپ کے لئے سہولتیں پیدا کروں گا۔'' انھوں نے کہا کہ میں علوم دینیہ سے معمولی واقفیت رکھتا ہوں، فقہ واصول کا درس نہیں دے سکتا جب تک خود علوم دینیہ حاصل نہ کرلوں۔ طے یہ پایا کہ نجف اشرف جا کے علم دین حاصل کریں، نواب نے پانچ ہزار روپے ان کو دیئے اور ہندوستان کا یہ فلسفی علم دین حاصل کرنے کے لئے باب مدینہ علم کی طرف روانہ ہوا۔ بمبئی پہنچ کر بادبانی جہاز میں بیٹھے۔ مشہور ہے پندرہ دن کی مسافت طے کی تھی کہ بادمخالف کا طوفان اس زور سے آیا کہ ناخدا بادبان لپیٹ نہ سکا، مخالف ہوا بھری اور تیسرے دن ساحل بمبئی پر لا کھڑا کیا۔ مگر دلیرانہ ہمت اور جواں مردانہ عزم کف بردہان سمندر کو للکار کے پھر اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ اب کی سمندر مغلوب اور بیڑا پار تھا۔ نجف اشرف پہنچ کے علامہ سید مہدی طباطبائی اور آغا باقر بہبانی، کے درس میں شرکت کی اور پانچ برس میں فقہ واصول کا دورہ مکمل کیا۔ اس وقت نجف اشرف کی یہ خصوصیت مشہور تھی ''خُبزُ الشَّعِیرِ لَحمُ البَعِیرِ زِیَارَۃُ الاَمِیرِ'' جو کی روٹی، اونٹ کا گوشت اور امیر المومنینؑ کی زیارت۔

اونٹ کا گوشت تو کبھی کبھی ملتا ہوگا نمک اور رطب سے روٹی کھائی جاتی تھی، چار پانچ روپیہ ماہانہ کا خرچ تھا، کپڑے وغیرہ ملا کے زیادہ سے زیادہ دس روپیہ ماہوار کا صرف ہوتا تھا۔ ان کے پاس ایک ہزار روپیہ سال کے حساب سے روپیہ تھا، جس سے وہ دینی کتابیں خریدتے تھے ان کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنے کو تبلیغ کے لئے تیار کرتے تھے۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کی تبلیغ کا سلسلہ قیامت تک باقی رہے۔ اس کے ساتھ وہ انسان کی عمر طبعی کی حد بھی جانتے تھے تو دعا کرتے تھے کہ خداوندا میری اولاد میں قیامت تک علم دین باقی رہے۔ اس کا یہ پُرلطف واقعہ علامہ کنتوری نے لکھا ہے:-

میرے ایک بزرگ رسول پور کے جناب غفران مآبؒ کے ہم سفر تھے۔ نجف میں شب قدر کے اعمال کئے اور ان کو بھی شریک کیا اور فرمایا کہ جب ایک عمود نور قبّہ مبارکہ سے آسمان تک نظر آئے تو وہی استجابت دعا کا وقت ہے۔ جب وہ وقت آیا تو جناب غفران مآبؒ نے دعا کی: ''خداوندا بحق صاحب قبر میری اولاد سے قیامت تک علم دین نہ جائے۔'' سید صاحب نے دعا کی کہ خداوندا ''رسول پور کی بارہ پٹی میں سوا میرے اور کوئی میرا شریک نہ ہو'' جناب غفران مآبؒ نے ان کو ایک دو ہنٹر مار کر کہا: ''اے کمبخت! یہ کیا دعا کی؟'' سید صاحب نے کہا: ''تم زمینداری کا مزا کیا جانو؟ ملّا آدمی، لڑکے پڑھانے کا تم کو مزا ہے زمینداری کو کیا جانو؟ اس کی جڑ پاتال میں ہوتی ہے جیسے دوب کی جڑ۔ (تاریخ العلماء ص ۱۵۰)

جب درجۂ اجتہاد پر فائز ہوگئے تو اپنی کتابوں کا پشتارہ لے کے ایران آئے اور کچھ دن قم میں قیام کیا۔ وہاں بھی بہت سی کتابیں خریدیں۔ پھر سندھ کے راستے ہندوستان پہنچے۔ نواب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک لاکھ کی کتابیں مختلف مذاہب کی دو دفعہ منگوا کے دیں اور وہ سیاسی توڑ جوڑ سے اپنے کو علاحدہ کر کے صرف ایک مقصد کو سامنے رکھ کے بیک وقت تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تبلیغ میں مشغول ہوگئے۔

تصنیف وتالیف

تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو سب سے پہلے ''عماد الاسلام'' کی پہلی جلد الٰہیات سے شروع کی جس میں حکمائے یونان، فلاسفۂ ہندوستان اور علمائے امت کے اقوال کے ردوابطال میں جو معرکے دکھلائے ہیں اس نے علمائے سابقین ولاحقین کے کارنامے محو کر دیئے۔

علامہ عبدالحسین صاحب استاد فلسفہ (جامعہ سلطانیہ لکھنؤ) اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

یہ ایک ایسی جامع اور حاوی کتاب ہے جس کی نظیر مذہب امامیہ کے کتب خانہ بلکہ اسلامی کتاب خانہ میں ناپید ہے۔ اس کی تعریف کے لئے میدان قلم کوتاہ اور جولانیٔ دماغ ناکافی ہے۔ اس میں ایسے مطالب عالیہ بیان کئے گئے ہیں جن کا سمجھنا خالی از اشکال نہیں، چہ جائے کہ ان کی توضیح وتقریر کرنا۔ مرحوم اَعْلَی اللّٰہُ دَرَجَتَہٗ نے یہ کتاب نہیں لکھی بلکہ درسگاہِ تحقیق اور بزم قدس منعقد کی ہے، جس میں تمام علماء، حکماء اور متکلمین اسلام کو مدعو کرلیا ہے۔ اس میں اگر ایک طرف افلاطون الٰہی مع اپنی تحقیقات کے، ارسطو مع اپنی آراء کے جلوہ افروز ہے۔ تو دوسری طرف ابوالنصر فارابی، شیخ الرئیس ابوعلی بن سینا مع شفاء واشارات کے زیب دہِ انجمن ہیں۔ ایک طرف اگر بہمن یار مع تجرید کے، میر باقر داماد مع اپنی تصنیفات کے زینت افزائے بزم ہیں، تو دوسری طرف علامہ حلّی مع ''نہایت المرام'' کے، قوشجی مع شرح تجرید کے، شیخ مفید مع مقالات کے، سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ، مع شافی کے، سید علی بن طاؤس مع طرائف کے، رونق افزائے محفل ہیں، وسط میں اشاعرہ اور معتزلہ کا گروہ مع اپنے تلامذہ اور اتباع کے جن میں حافظ نظام، ابوالہذیل علاف بلخی وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ ایک گوشہ میں ملا صدرالدین شیرازی مع اسفار اور شارح مواقف مع اپنی تصنیفات کے تشریف فرما ہیں، دوسرے گوشہ مین شہید ثالث قاضی نوراللہ شوستری اور علامہ فضل بن روز بہان مع احقاق الحق اور ابطال الباطل کے حاضر ہیں۔

صدر نشین بزم قدس جناب غفران مآب علیہ الرحمہ ہیں، آپ کے ہاتھوں میں عنانِ کمیت قلم ہے اور وہ اس کو میدان تحقیق میں جولان کرر ہے ہیں۔ آپ کی تحقیق اتنی کامل، آپ کی نظر

اتنی وسیع ہے کہ آپ کے فیصلہ کو تمام علماء مانے ہوئے ہیں، آپ پر مجال نہیں کہ کوئی اعتراض کرسکے اور آپ کی تحقیق کو رد کرسکے۔

(رسالہ مبلغ غفران مآب نمبر)

عراق کے مشہور عالم شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحب 'جواہر الکلام' لکھتے ہیں:

''مراۃ العقول (الملقب بعماد الاسلام) جس کے مصنف ہیں اسلام کے رکن اعظم اور خلق خدا پر خدا کی حجت، جنھوں نے عقول کو اپنی موشگافیوں سے حیران کردیا اور عقلی شبہوں کو اپنی فکر ونظر کے ستاروں سے روشن کردیا، جن کے انواع علوم کی حدیں معین کرنے سے اجناس وفصول قاصر ہیں اور جنھوں نے تحریر کی مشکل شکلوں کو اپنے بیان کے منطوق کے ذریعہ سے واضح کیا، تمام خلق خدا کے مرکز اور عقول عشرہ[۱] کے مدمقابل گیارہویں عقل'' (ظل ممدود)

مفتی محمد عباس صاحب ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

بلند مرتبہ علامہ، خدا کی بولتی ہوئی کتاب، جن کی ذات پر اجتہاد ختم ہوگیا۔۔۔ خدا کی سب سے بڑی آیت اولین وآخرین کے اندر۔ (ظل ممدود)

علامہ شیخ احمد یمنی، شیروانی لکھتے ہیں:

آپ کی مہارت علم اصول میں جعفری، آپ کا احاطہ فروع میں یوسفی، آپ کی درایت فہم حدیث میں باقری، آپ کی تحریر وتقریر حقائق کی پردہ دار اور نکتوں کو واضح کرنے والی ہے۔ کون آپ کی ہمسری کرسکتا ہے؟ اگر علامہ حلّی ہوتے تو آپ کی اقتدا کرتے، اگر مجلسیؒ اور مفیدؒ آپ کے مفید مجالس درس میں، حاضر ہوتے تو بحارُالانوار کو آپ کے دریائے علم کے پہلو میں حقیر سمجھتے۔ اللہ اکبر کس قدر علوم وفنون میں آپ کا حصہ بلند اور مقام رفیع ہے۔

(ظل ممدود مرتبہ جناب مفتی میر عباس صاحب)

مولانا اعجاز حسین صاحب اور برادر مولانا میر حامد حسین صاحب مرحوم شذور العقیان فی تراجم الاعیان میں اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے تلمذ حاصل کیا خدا کی اس نشانی سے جو تمام عالموں کا رب ہے۔ وہ ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے مملکت ہندوستان میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو (باطل) کیا۔ یعنی علّامہ مولانا سید دلدار علی نصیر آبادیؒ۔

(منقول از حیات فردوس مکاں)

حقیقت میں خدا کو ان سے جو اہم کام لینا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ ان کا علم، ان کا عزم، ان کی ہمت اور ان کی سیرت ائمہ اہلبیتؑ کا پرتو ہو۔ یہی اوصاف ان کے علمی کارنامے کی جان ہیں۔ اگر ان کا علم، ان کی بلند نظر، ان کی تعمق فکر فوق البشر نہ ہوتی تو ہندوستان کی شیعیت کی تاریخ کچھ اور ہوتی ان کی بلند نظر ہر خامی کو دیکھتی تھی خواہ وہ کہیں ہو۔

وہ عراق جاکر وہاں کے علماء سے مرعوب نہیں ہوئے اور وہاں سے واپس آئے تو ان کی نقل نہیں اتاری۔ بلکہ ہندوستان میں ان طریقوں سے شیعیت کی ترویج کی جو یہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب تھے۔

ہندوستان میں شیعوں کی پہلی نماز جماعت

آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ شیعوں کی نماز جماعت ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتی تھی اور ایک نئی بات کی ابتداء کرنے کی نہ کسی کو

---

[۱] فلاسفہ یونان قائل ہیں کہ اللہ کی مخلوق بلاواسطہ عقل اوّل ہے اور عقل اوّل نے عقل ثانی کو پیدا کیا اور عقلِ ثانی نے عقل ثالث کو، یوں ہی دس عقول تک سلسلہ پہنچا اور نو فلک پیدا ہوئے، پھر انھیں عقول وافلاک کی شرکت سے تمام کائنات وجود میں آئی۔ ۱۲ (ظل ممدود۔ مرتبہ مفتی محمد عباس صاحب)

جرأت تھی اور نہ کوئی نماز پڑھانے والا میسّر تھا۔ پڑھے لکھے شیعہ عموماً اخباری تھے جن کے نزدیک جمعہ و جماعت درست نہیں۔ اس طرح شیعوں کی الگ کوئی اجتماعی زندگی نہ تھی اور بحیثیت شیعہ ایک قوم ہونے کا کوئی تصور کسی کے دماغ میں نہ تھا بلکہ عام طور پر لوگ اس کے اظہار سے کتراتے تھے جس کے نتائج کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

شیعہ قومیت کی تشکیل

اس وقت ضرورت اس کی تھی کہ شیعوں کے مذہبی عقائد انھیں بتائے جائیں ان کی نماز، ان کے مذہبی رواسم الگ قائم ہوں اور ان میں اتنی جرأت پیدا کی جائے کہ وہ بحیثیت شیعہ ایک اجتماعی زندگی اختیار کر کے ایک قوم بن جائیں اس کے لئے جناب غفران مآبؒ نے نواب حسن رضا خان کو آمادہ کیا کہ شیعوں کی نماز جماعت شروع ہو۔ نواب کے گھر میں ملا محمد علی فیض آبادی اور شیخ اکبر علی چشتی مودودی نے غفران مآبؒ کی اقتدا میں چند مخصوصین کے ساتھ نماز پڑھی۔ یہ ۱۳؍رجب ۱۲۰۰ھ کی مبارک تاریخ تھی۔ قدسیؔ جائسی کا شعر ہے ؎

شیعیانِ ہند کی پہلی جماعت کی نماز
جس سے عہدِ آصف الدولہ کو ہے خاص امتیاز

نماز جمعہ کی ابتداء

اس کے بعد انھوں نے بڑی جرأت سے کام لیا اور مذہب میں گویا نئی بات کی ابتدا کی یعنی ۲۷؍رجب کو جمعہ کی نماز قائم کی جو عراق و ایران میں بھی نہ ہوتی تھی، اس کے وجوب پر ایک استدلالی کتاب لکھی۔ اس طرح انھوں نے عراق و ایران کی بھی ایک کمی کو یہاں پورا کیا۔

موعظہ کی ابتداء

نماز کے بعد موعظہ شروع ہوا جس میں رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا گیا۔ سرفراز الدولہ، آصف الدولہ کو بھی ایک دن کھینچ لائے مگر غفران مآب سے کہہ دیا کہ نواب بھنگ کے عادی ہیں، اس کے متعلق کچھ نہ کہیۓ گا لیکن اس دن کا موعظہ مسکرات ہی کی حرمت پر تھا نواب کا ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا۔ رہ رہ کے اپنی لمبی لمبی موچھوں کو تاؤ دیتے تھے۔ وزیر اعظم کی نظر نواب پر تھی۔ دل میں پنکھے لگے تھے کہ دیکھیۓ خدا آج کیا دکھاتا ہے۔ ابھی موعظہ تمام نہ ہوا تھا کہ نواب نے بلند آواز سے کہا کہ باوا جان کے سر کی قسم جو آج سے بھنگ کو منھ لگایا ہو، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا کہ جو قلوب کو پھیر سکتا تھا اور سینہ میں وہ دل دیا تھا جو سوا خدا کے کسی سے نہ ڈرتا تھا۔

اصلاحی کوشش

تحریر کے ذریعہ جو انھوں نے اصلاحی کوششیں کیں، وہ ہندوستان کی ضرورت کے مطابق تھیں، تقلیدی نہ تھیں بلکہ خود ان کی قوتِ اجتہاد کا نتیجہ تھیں، اس لئے ان کی اہمیت اور افادیت ہندوستان تک محدود نہیں رہی۔

تصوف کی مخالفت

ہندوستان میں تصوف کا بڑا زور تھا۔ علمائے عراق نے اس پر شیعی نقطہ نظر کی وضاحت نہیں کی۔ علمائے ایران میں علامہ مجلسیؒ نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔ اس وجہ سے اکثر علمائے شیعہ کو اس بارے میں مسامحہ ہوتا رہا۔ علامہ محسن فیض صاحبِ تفسیر صافی نے سماع (قوالی) کو جائز قرار دیا۔ شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری نے اکابر صوفیہ کی تعریف میں اتنی خامہ فرسائی کی کہ ان کی مذہبی حیثیت مشکوک ہوگئی اور صاحب تاریخ علماء کو لکھنا پڑا کہ ان کو بدمذہب سمجھنا درست نہیں کیوں کہ انھوں نے صوفیہ کی تعریف کے ساتھ ان کے اقوال کی تاویل کی ہے اور اس کا کچھ اور مطلب بیان کیا ہے۔ یعنی اس وقت تک کوئی واضح خط صوفیت اور شیعیت کے درمیان نہ تھا۔ جناب غفران مآبؒ نے معرکہ آراء کتاب ''شہاب ثاقب'' صوفیت کی رد میں لکھ کر کے ان کے فلسفہ اور عمل و قول کی دھجّیاں اُڑا دیں اور ایسا قلع قمع کیا کہ شیعوں سے اس کا استیصال ہوگیا۔

اخباریت کی رد

ہندوستان کے شیعوں میں عام طور سے اخباریت پھیلی

ہوئی تھی، وہ اجتہاد وتقلید کو ناجائز سمجھتے تھے۔ غفران مآبؒ نے اس موضوع پر ''اساس الاصول'' لکھ کے اخباریت کی جڑ اُکھاڑ دی۔ اب ہندوستان میں اخباری نہ ہونے کے برابر ہیں۔

علم کلام میں انھوں نے توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت پر مستقل کتابیں لکھیں اور بڑے شدومد سے جبر وقدر، رویت باری، معصیت انبیاء اور خلافت غیر منصوص کی رد کر کے مذہب اہل بیت کو ثابت کیا۔ اس سے پہلے عقلی ونقلی حیثیت سے اتنی مدلل، اتنی مفصل، اتنی مکمل بحث کسی نے نہیں کی تھی۔ اس سے ہندوستان میں ایک ہلچل مچ گئی اور شیعہ سنی دونوں نے ان کے خلاف محاذ قائم کر دیا۔

اخباریوں کی طرف سے ''اساس الاصول'' کی رد لکھی گئی۔ تفضّل حسین خان علامہ نے عمادالاسلام پر اعتراضات کئے۔ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے تحفہ اثناعشریہ میں توحید سے لے کر معاد تک شیعہ نقطۂ نظر کی رد کی۔ اس طرح ایک میدانِ کارزار گرم ہوگیا۔ ایک ایک موضوع پر کتابوں کے انبار لگ گئے اور ایک ایسا ذخیرہ فراہم ہوگیا جو عراق وایران کو بھی آج تک نصیب نہیں ہوا۔

تعزیہ داری

تعزیہ داری کا وجود ہندوستان میں بہت پہلے سے تھا۔ دکن میں عاشور خانے، سندھ میں امام بارگاہ تھی۔ شمالی ہند میں پھونس اور کپڑے کے امام باڑے محرم میں بنتے تھے۔ دس دن کے لئے پختہ عمارت کی کیا ضرورت تھی مُبکی نظمیں تنہا اور چند آدمی مل کے راگ سے پڑھتے تھے۔ موجودہ زمانہ کی سوزخوانی اسی کی یادگار ہے۔ اس سے بجز حصول ثواب اور کوئی افادیت نہ تھی، وہ بھی جب کہ حدود شرع میں ہو۔ جلوس بھی نکلتے تھے جن میں شہنائی، روشن چوکی، طبل، تاشہ، جھانجھ بجتے اور ماہی مراتب (مچھلی اور چوپاؤں کے سر چاندی اور پیتل کے بانسوں پر لگے ہوئے) کے ساتھ براق اور گنبد تعزیوں کی جگہ ہوتے تھے، کچھ کچھ دور پر ٹھہر ٹھہر کے بانک اور پٹے کا فن دکھاتے اور یا حسینؑ کی آواز بلند کرتے، ان رواسم کی بجاآوری میں سب مسلمان یکساں طور پر شریک تھے۔

غفران مآبؒ نے روشن چوکی اور شہنائی کو آلات غنا ہونے کی وجہ سے حرام اور طبل، تاشہ کو جنگی باجا ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا، جھنڈیوں، ماہی مراتب کے بدلے علم، گنبد کی جگہ تعزیئے اور بانک اور پٹے کا فن دکھانے کے بجائے سینہ زنی اور حسینؑ حسینؑ کو رواج دیا۔ حاضری، مہندی اور نذر ونیاز ایسے رواسم قائم کئے۔ محرم کے دس دن میں ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کیا۔ مجلسوں میں عراق کی روضہ خوانی کے طرز پر ذاکری شروع کی جس میں اہلبیتؑ کے فضائل میں حدیثیں بھی مصائب کے ساتھ بیان کی جانے لگیں۔ اس طرح مجلس کی افادیت بڑھ گئی اور اس میں تبلیغی پہلو پیدا ہوگیا اور ان رواسم کو اتنا عام کر دیا کہ گھر گھر مجلس اور گلی گلی تعزیئے اٹھنے لگے۔ اس طرح انھوں نے شیعوں کی تعزیہ داری کو ایک نئی شکل دے کر عام مسلمانوں سے علیٰحدہ کر دیا اور اس سے مذہبی تبلیغ، قومی تنظیم اور شیعی تمدن کی تشکیل کی۔

اس سلسلہ میں ایک کمی جو عراق وایران میں ہے، انھوں نے یہاں اس کو پورا کیا۔ عراق وایران کے علماء مجلسیں پڑھنا اپنی شان اور مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکری جسے وہاں روضہ خوانی کہتے ہیں کم پڑھے لکھے لوگوں کا کام رہ گیا اور اس میں کوئی ترقی نہ ہوسکی۔ ہندوستان میں مجلسوں میں مرثیہ پڑھا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مجلس شاعرانہ کمال دکھانے کی جگہ نہیں ہے، اس میں فضائل ومصائبِ اہلبیتؑ بیان ہونا چاہئے۔ انھوں نے واقعات کربلا پر معتبر روایتوں کا ایک بڑا ذخیرہ ''اثارۃ الاحزان'' کے نام سے پیش کیا اور عاشورہ کے دن عصر کے بعد خود مجلس پڑھنے کی ابتداء کی۔ اس طرح ہندوستان کے علماء میں انھوں نے یہ سنت قائم کی کہ ان کے بعد ان کے جانشین یہ مجلس پڑھتے رہے۔ آج بھی یہ مجلس اسی وقت ان کے امام باڑے میں ہوتی ہے۔ اب یہاں کے علماء کو جو حقیقت میں

انھیں کے ذرّیات تھے اس پر اعتراض اور اس سے احتراز کی کیا ہمت ہوسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثرت سے علماء مجلسیں پڑھنے لگے، یہاں تک کہ ان کی چوتھی پشت میں بحرالعلوم جناب محمد حسین عرف علن صاحب پیدا ہوئے جنھوں نے ذاکری کے فن میں انقلاب پیدا کیا۔ حدیث و تفسیر اور فلسفیانہ موشگافیوں سے تقریر کو علمی بنا کر موجودہ طرز ذاکری کے موجد ہوئے۔

درس و تدریس

غفران مآبؒ نے مجلس درس قائم کی جس میں بقول حضرت سید العلماءؒ وہ ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے تھے جو تنہا اپنے شاگردوں کو تمام علوم کی تعلیم دے کے جید عالم بنا دیتے تھے اور سب سے بڑا کارنامہ ان کا یہ ہے کہ انھوں نے اپنی سیرت و کردار اور تعلیم سے اپنے شاگردوں کو اتنا متاثر کیا اور ایسی اسپرٹ پیدا کردی کہ وہ کار تبلیغ میں ان کے شریک ہوگئے اور ہندوستان کے جس گوشہ میں جس کو بھیج دیا وہ خدا پر بھروسہ کرکے گھر بار چھوڑ کے روانہ ہوگیا۔ اس طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں ان کے مبلغین پہونچ گئے۔ وہاں کے شیعوں کو عقائد کی تعلیم دی اور ان کے دلوں سے خوف وہراس دور کرکے اپنے اعمال کو عام مسلمانوں سے علٰحدہ بجالانے کی جرأت پیدا کی۔ جمعہ و جماعت قائم کی۔ مسجد و امام باڑہ بنوایا، عزاداری کو رواج دیا، بدعتوں سے روکا، دفن، کفن، نکاح، طلاق سب شیعوں کے طریقہ پر ہونے لگا۔ اس طرح سارے ہندوستان میں بغیر کسی منصوبے اور سرمایہ کے انھوں نے تبلیغ کرکے پیغمبری کا کام انجام دیا اور صدیوں سے جو خوف دلوں میں بیٹھا تھا وہ دور ہوگیا اور سارے ہندوستان میں شیعیت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر جگہ شیعہ بحیثیت ایک قوم کے نظر آنے لگے جن کے نام، مذہبی رواسم، اخلاق، طرز معاشرت، معیارِ فکر، زاویہ نظر، تعلیم اور لٹریچر سب الگ ہوکر ایک مستقل قوم بن گئے اور ہندوستان کی قوموں میں اپنی علمی اور تمدنی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا۔

مذہبی معاملات میں ان کے نقطۂ نظر اور اندازِ فکر میں تبدیلی ہوگئی وہ رسولؐ کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے انھیں افراد کے دامن سے وابستہ ہوگئے جن کا تعارف رسولؐ کی زندگی کا مستقل مشن تھا اور وہ اوروں کے مذہبی اور روحانی سیادت و قیادت کے قائل نہ رہے جس کے نتیجہ میں شیخ سدّو کا بکرا، میراں جی، سید احمد کبیر، سید سالار مدار صاحب کا جھنڈا اور پیران پیر کی فاتحہ خوانی ختم ہوگئی۔ اور جب اہل بیتؑ رسول کے فضائل و مناقب بیان کئے جانے لگے اور فاتحہ و عزاداری نے ایک انقلابی کروٹ بدلی اور دوسروں کی طرف سے اس پر بدعت کے فتوے لگنے لگے تو حاضری، نذر و نیاز اور علم و تعزیہ کو بدعت کہنے والوں کو چارہ نہ رہا کہ وہ شیخ سدّو کے گلگلے، سید احمد کبیر کی گائے اور سید سالار کے جھنڈے کو بھی بند کرائیں۔ اس طرح اہل سنت کو بھی فائدہ پہنچا اور غفران مآبؒ کی تحریک کی اتنی غیر معمولی کامیابی کو تائید خدا سمجھا گیا۔ شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی صاحبِ جواہر لکھتے ہیں:

''زندہ کرنے والے مذہبی رسوم کے، آباد کرنے والے اس کی منزلوں کے، وہ ماہتاب جس کا طلوع گمراہوں کی ہدایت، وہ شہسوار جن کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا، جن کی نگہداری میں اسلام کے ستون سربلند ہوئے۔'' (ظل ممدود)

مفتی میر عباس صاحب جناب غفران مآبؒ کے صاحبزادوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:

''اے رفعت و بلندی کے مالک، اے ورع و تقویٰ کی جائے پناہ، اے ہدایت کے نور، اے آفتاب روز آپ کے سبب سے ہماری سرزمین پر شریعت حضرت محمد مصطفیٰؐ ظاہر ہوئی۔ اگر آپ نہ ہوتے، اے میرے سرداران ملّت، تو ہمیں خبر بھی نہ ہوتی کہ ہمارا دین و مذہب کیا ہے۔ کیا کہنا آپ لوگوں کا کہ جو شخص آپ کی زیارت کرے وہ ہدایت پا جائے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے آپ کو کثیر علم کا مالک بنایا، ناک رگڑ دینے کو دشمنوں کی۔ میرا فخر

ہے کہ میں ہدایت حاصل کرنے والا ہوں، اس یگانۂ عصر، امام سے" (رطب العرب ص۔ ۸۲)

علامہ کنتوری لکھتے ہیں:

بلا تشبیہ ہمارے اس ہادیٔ دین نے ہندوستان میں وہی کام کیا جو مدینہ میں ان کے جد نامدار نے۔۔۔ اس خاندان ہدایت کے دشمن بدخواہ ہمیشہ روسیاہ رہیں گے۔۔۔ تمہارے گھروں میں جو چبوترے بھنگ نوشی کے تھے، ان پر سجّادے بچھوا دیئے، تمہاری نذر و نیاز میں جو شیخ سدّو کا بکرا، شیخ فرید کی شیرینی، بابا شکر گنج کا کونڈا، شاہ مدار کی کندوری، سید سالار کی بیرق جاری تھی، اب عمل گوسفند اور حضرت عباسؑ کی حاضری اور علم وتعزیہ بنام شہدائے کربلا جاری کرائے۔

مولانا محمد حسین صاحب قبلہ نوگانوی تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں:

آپ کا فضل وکمال، علوئے مرتبت واجلال بیان سے باہر ہے۔ فقط یہی کافی ہے کہ ہندوستان میں دین اسلام آپ ہی کے وجود سے پایا جاتا ہے۔۔۔ اہل علم پر کیا جہلاء پر بھی آپ کا احسان ہے۔ جیسے حضرت علیؑ کی تلوار آبدار نے سرکشان عرب کو زیر کر دیا اور لات، عزّیٰ اور منات تینوں کو طاقہائے حرم سے منھ کے بل گرا دیا، ایسے ہی ہندوستان میں اگرچہ برائے نام تشیع تھا مگر کہیں نقشہ بھنگ نوشی، کہیں احمد کبیر کی گائے۔۔۔ یہاں بھی دلدار علی کے سیفِ قلم نے ہندوستان کو جو کفرستان تھا دارالایمان بنا دیا۔ یہ آپ کے خلوص کا اثر ہے جو جابجا اس زمانہ پرآشوب میں پھر کر، دشمنوں میں رہ کر، عرب وعجم کا سفر دور دراز کر کے، علوم دینیہ حاصل کر کے تحت قبہ ابی عبداللہ الحسینؑ جو دعا مانگی تھی کہ میری اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہے، سو بحمد اللہ اب تک ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا اور آپ کا خاندان، خاندانِ اجتہاد کے نام سے قائم ہو گیا۔ (تاریخ العلماء ص ۷۔۱۴)

مولانا اعجاز حسین صاحب برادر مولانا حامد حسین صاحب لکھتے ہیں:

انھوں نے ہندوستان کے شہروں میں دین کو زندہ کیا اور بدعت وجاہلیت کے آثار کو محو و باطل کر دیا۔

اس سے بڑھ کر ان کی خوش قسمتی اور کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے سامنے ہندوستان بھر میں شیعیت سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی اور لکھنؤ اس کا مرکز بن گیا جس کے در و دیوار پر شیعیت چھا گئی اور اس طرف عام میلان ہو گیا۔ ہندو تک تعزیہ داری کرنے لگے اور کثرت سے علماء، فضلاء، اطباء، شعراء اور بافہم افراد شیعہ ہو گئے۔ مرزا جعفر علی فصیحؔ مثنوی نان ونمک میں فرماتے ہیں ؎

حامیٔ دیں، ماحیٔ کفر وضلال
سرگروہِ عالمان باکمال
علم سے جس کے عمل توام ہوا
دین جس کے زور سے محکم ہوا
لکھنؤ اب سبز وار ہند ہے
دم بدم افزوں بہار ہند ہے

لیکن وہ حالت پیدا نہ ہونے پائی جو سنّی حکومتوں میں شیعوں کی تھی۔ خاص لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل کا ہندوستان میں سب سے بڑا علمی خاندان اور سب سے بڑی درس گاہ (مدرسۂ نظامیہ) اور کثرت سے علماء موجود تھے، جمعہ وجماعت وموعظہ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ حکومت میں ان کا اتنا اثر تھا کہ اس زمانہ میں قضا اور افتاء کی مسند پر وہی متمکن تھے۔

غفران مآبؒ نے حکومت سے اپنے کو علاحدہ رکھا۔ ان کا خیال تھا کہ نائبِ امام کا حکومت کے سامنے جھکنا اور اس کی دربار

داری کرنا منصب نیابت کی توہین اوران مشاغل میں کمی واقع ہونے کا سبب ہے جواس عہدہ کے فرائض میں داخل ہیں۔ان کی اس علاحدگی اور بے نیازی کی وجہ سے آصف الدولہ کوان سے اور ان کی تحریکوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ معمولی معمولی آدمی خطابات سے سرفراز ہوئے۔مگر غفران مآبؒ زندگی بھر مولوی صاحب کہے گئے۔شعراء کے وظائف معین ہوئے،صوفیوں اور ولیوں پرعنایتیں ہوئیں۔گورکھپور شکار کھیلنے گئے وہاں محرم کا چاند نکل آیا۔ایک صوفی کو(جومیاں صاحب مشہور تھے)تعزیہ رکھے ہوئے دیکھا ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر دے آئے، جواب تک موجود ہے،مگرغفران مآبؒ ان کے شہرمیں تعزیہ داری اوراس کی تبلیغ کرتے رہے اورآصف وہیں بیٹھے لکھ لٹاتے رہے لیکن غفران مآبؒ پران کی چشم کرم کبھی نہ پڑی۔ہاں آصف الدولہ کو ان کے علمی وروحانی فیوض وبرکات کے بڑھنے سے خلفائے بنی امیہ وبنی عباس کی طرح اپنی حکومت کے لئے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوااوران پرکسی طرح کی پابندی عائد نہیں کی، بلکہ خود بھی تعزیہ داری وغیرہ بڑے انہماک سے کرتے رہے۔اتنا موقع میسر آتے ہی ایک حقیقی نائبِ امام نے دنیا کے سامنے ائمہ اہلبیتؑ کی سیرت، علمی وروحانی منزلت اور صحیح اسلامی تعلیمات کا اور گھر والوں کوایک ایسانمونہ بنا کے پیش کیا کہ قلوب ان کی طرف جھک گئے اورایک تازہ انقلاب پیدا ہوگیا۔دنیانے مان لیا کہ وہ اپنے علمی تبحر اورسیرت وکردار کی بلندی سے آفتاب ہدایت بن کے طالع ہوئے اور اپنی علمی موشگافیوں سے عقول کو حیران کردیا۔ لوگ دین خدا میں گروہ درگروہ داخل ہوئے جس میں جبر کا کوئی دخل نہ تھا، بلکہ آپ سن چکے ہیں کہ حکومت کے معاملات میں علمائے فرنگی محلی دخیل تھے یہاں تک کہ آصف الدولہ کا زمانہ ختم ہوا اور نواب سعادت علی کا دور ہوا۔اس وقت بھی حکومت کے حاشیہ پرعلمائے فرنگی محل ہی نظر آتے ہیں اور غفران مآبؒ کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

۱۲۳۵ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ ۱۲۰۰ء سے انھوں نے لکھنؤ میں تبلیغ شروع کی اور پینتیس برس میں شیعی دنیا میں انقلاب پیدا کرکے مذہب شیعہ کی تجدید کی۔یوں تو ہرصدی میں ایک مجدد مذہب پیدا ہوتا رہا ہے،ان لوگوں نے آثار اہل بیتؑ کو جمع کیا اور فقہ مدون کی،شیعوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ کرسکے اور یہ ان کے حالات کے مطابق تھا۔ تیرھویں صدی کے مجددِ مذہب غفرانمآبؒ تھے۔ انھوں نے عقلی دلیلوں سے مذہب اہلبیتؑ کوثابت کیا۔شیعوں کوحقیقی شیعہ بنایا اوران کی تعداد میں بے حد اضافہ کیا۔ ہرجگہ کے شیعوں کوان کے مذہب سے باخبر کردیا اور جو پیری مریدی کے رواسم اورنذرونیاز جاری تھی اس کو بند کرادیا۔ ان کی زندگی میں ہندوستان میں شیعہ ایک قوم کی حیثیت سے سر اُٹھا کر کھڑے ہوگئے۔اس غیرمعمولی کامیابی کو دیکھ کر حجۃ الاسلام مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی مجتہد العصر نے فرمایا ؎

ندید چشم فلک مثل ایں مجددِ دیں
کہ شاہداند بفضل وبزرگیش اعدا

ان کا فیض ہندوستان تک محدود نہیں رہا، وہ کربلا ونجف تک پہنچا۔انھوں نے اپنے دورقیام میں محسوس کیا کہ اہل کربلا ونجف کو پانی کی تکلیف ہے۔ انھوں نے آصف الدولہ کو آمادہ کرکے ایک نہر کربلا سے نجف تک کھدوائی جس پر اسی ہزار اشرفیاں صرف ہوئیں۔ ۱۲۳۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔امجد علی شاہ نے ان کوغفران مآبؒ کہنا اورلکھنا شروع کیا۔اس وقت سے وہ غفرانمآبؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔شیعیت کی یہ تجدید عہد آصف الدولہ کی بڑی خصوصیت ہے جس میں سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نائب السلطنت کا بڑا ہاتھ ہے ان ہی کی اعانت سے غفران مآبؒ عراق گئے اور وہاں سے آئے تو انھیں نے ان کو کتابیں فراہم کیں ان کی کفالت کی اوران کے امور میں سہولتیں بہم پہنچاتے رہے۔تقریباً ایک فرلانگ لمبی اور چوتھائی فرلانگ چوڑی زمین ناف شہر میں دی جس کے ایک سرے پر انھوں نے اپنا مکان اور دوسرے سرے پر امام باڑہ بنایا۔ان

کے بعد ان کی اولاد نے اپنے مکانات بنوائے جس سے بیچ کی ساری جگہ بھر گئی۔ غدر کے بعد وکٹوریہ اسٹریٹ نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور بہت سے مکانات گرا دیئے گئے۔

قبرستان

لکھنؤ میں شیعوں کا کوئی قبرستان نہ تھا۔ انھوں نے اپنے امام باڑہ کے آگے بہت بڑا قطعہ زمین قبرستان کے لئے وقف کیا۔

یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں

آصف الدولہ کے بعد ان کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں ۱۲۱۲ھ/ ۱۸۱۷ء میں مسند نشین ہوئے۔ انھوں نے تال کٹورے کی کربلا اور حضرت عباس کی درگاہ بنوائی۔ اس کے گنبد پر سونا چڑھوایا اور محرم کے دس دن عزاداری ہوتی تھی، انھوں نے چہلم تک عزاداری بڑھا دی۔

شاہ زمن غازی الدین حیدر

سعادت علی خاں کے فرزندِ اکبر غازی الدین حیدر ۱۲۲۹ھ/ ۱۹۲۴ء میں ان کے بعد تخت نشیں ہوئے انھوں نے روضہ حضرت علیؑ کی نقل بنوائی اور کئی کروڑ روپیہ کمپنی کو دیا کہ اس کا سود زائرین ومجاورینِ کربلا پر تقسیم کیا جایا کرے۔ ۱۲۳۵ھ میں دس ہزار کئی سو روپیہ ماہوار وہاں تقسیم ہوتا تھا جب کہ سود کی شرح ۶/ آنے سیکڑہ تھی اس کو دس روپۓ سود کی شرح کے حساب سے لاکھوں روپیہ تقسیم ہوتا ہوگا۔

غازی الدین حیدر کے اکلوتے بیٹے نصیر الدین حیدر

۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۷ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے پار میں کربلا بنوائی اور عزاداری پہلی محرم سے آٹھویں ربیع الاول تک بڑھا دی جواب تک سارے ہندوستان میں ہوتی ہے۔

سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر

سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر نے جمعرات کی مجلس قائم کی۔

ابو الفتح معین الدین محمد علی شاہ

بادشاہ بیگم اور منا جان کی گرفتاری کے دوسرے دن آٹھ جولائی ۱۸۳۷ء ۱۲۵۳ھ محمد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے مجتہد العصر سید محمد صاحب نے تاج شاہی سر پر رکھا۔

سلامی کی توپیں سر ہوئیں، نذریں گذریں۔ ابھی وہ حکومت سنبھالنے بھی نہ پائے تھے کہ بائیس دن کے بعد رزیڈینٹ نے ایک نیا عہد نامہ دستخط کے لئے پیش کیا جس میں دو باتیں اہم تھیں ایک یہ کہ فوج اور کم کر دی جائے دوسری یہ کہ اگر ملک کے کسی حصّہ میں بدنظمی پائی گئی تو کمپنی اس پر قبضہ کر لے گی اور اس وقت تک اپنے قبضہ میں رکھے گی جب تک مناسب سمجھے گی۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے یہ صورت پیدا ہوگئی تھی کہ یا انگریزوں کی شرطیں منظور کرو یا حکومت سے ہاتھ دھوؤ۔

ع   بمرگش بگیر تا بہ تپ راضی شوی

کی بنا پر سب انگریزوں کی شرطیں منظور کرتے رہے۔ محمد علی شاہ نے بھی دستخط کر دی۔ ترسٹھ برس کی عمر تھی، امراض نے گھیر لیا تھا، بینائی کم ہوگئی، رعشہ اتنا تھا کہ اپنے ہاتھ سے کھا بھی نہ سکتے تھے مگر سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیت جوان تھی سعادت علی خاں کے زمانہ میں امور سلطنت میں شریک تھے۔ حکیم بندہ مہدی کو وزارت سپرد کی۔ علمائے فرنگی محل کو قضا وافتاء کی مسند پر بحال رکھا۔ نئے دفاتر اور نئے قاعدے جاری کر کے نظام مملکت کو چست ودرست کیا۔ ہر طرف واہ واہ ہونے لگی۔ امور مملکت اور عقبیٰ کے سوا کسی طرف توجہ نہ تھی۔ ایک عالی شان جامع مسجد کی بنیاد رکھی جو نقشہ کے لحاظ سے دہلی کی جامع مسجد سے وسعت اور شان میں بڑھی ہوئی تھی، نصف تک بننے پائی تھی کہ انتقال ہوگیا۔

جمنیا باغ میں حسین آباد کا امام باڑہ نہایت خوبصورت تعمیر کرایا۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں چار سو مکانات شہر کے بے گھر ناداروں کے لئے بنوائے۔ ایک حصّہ کا نام ''شریف منزل'' اور دوسرے کا ''رئیس منزل'' ہے۔ ''رئیس منزل'' میں وہ لوگ

رہتے ہیں جو برائے نام کرایہ دے سکتے ہیں۔ شریف منزل کا کرایہ نہیں ہر مکان میں پختہ کمرہ ودالان وصحن وپاخانہ اور باورچی خانہ ہے۔ بمبئی میں حجاج وزائرین کے لئے مسافر خانہ تعمیر کرایا چار روپیہ سیکڑہ سود پر پچاس لاکھ روپیہ ان سب کے مصارف اور دیگر امور خیر کے لئے کمپنی کے پاس جمع کئے۔

سید حسین صاحب مجتہد العصر سید العلماء (خلف غفرانمآبؒ) نے نہر آصفی کے جابجا سے پٹ جانے اور زائرین ومجاورین کربلا ونجف کو پانی کی تکلیف سے مطلع کیا اور اس کی درستی کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ بتایا۔ انھوں نے وہ رقم فوراً ان کے حوالے کی جو رزیڈنٹ کے ذریعہ ہائی کمشنر بغداد کو بھیج دی گئی کہ وہ آقا سید ابراہیم صاحب ضوابط الاصول کو دے دیں۔ اس وقت وہ عراق کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان کو لکھا :-

اَبُو الْفَتحِ مُعِینُ الدِّینِ مُحَمَّد عَلِیٰ شَاہْ خَلَّدَ اللّٰہُ مُلْکَہٗ مَقْرُوْنَۃً بِالعِزِّ وَالْجَاہِ حَیْثُ اِنْ رَغْبَۃِ اِلیٰ خِدْمَاتِ الْمَشَاہِدِ الْکَرِیْمِ سَلَامُ اللّٰہِ عَلَی اَعْقَابِہَا وَعَلیٰ مَنْ جُلَّ بِتُرَابِہَا لَمَّا سَمِعَ خَبَرَ اخْتِلَاْلِ النَّہْرِ الْحُسَیْنِیِ الطَّفِّ طباعہ اِلَیٰ تَتْمِیْمِ وَتَصْفِیَۃِ وَتَرْمِیْمِہٖ دَفْعاً لِمَضَرَّۃِ السَّائِرِیْنَ وَحُلْیًا لِمَسَرَّۃِ الزَّائِرِیْنَ فَاَمَرَ سَدَّ ان خزانۃ العَامِرَۃِ وَاَشَارَہ بِاَنَامُلِہٖ الْھَاصِرَۃِ اِلیٰ اِرْسَالِ مِائَۃِ وَخَمْسِیْنَ رُوْبِیَۃً لکھْنَوِیَّۃ وَجَعَلَ امراۃً وَتَوْلِیَۃً اِلَیْکَ بِالْتِمَاسِ اَقَلِّ الْبَرِیَّۃ وَھَاھِیَ مُرْسَلَۃٌ اِلَیْکَ بِوَسَاطَۃِ الْاِنْکلِسِیَّۃِ۔

ابوالفتح معین الدین شاہ نے بسبب انتہائی رغبت کے جو انھیں مشاہد مشرفہ کی خدمت کے ساتھ ہے جب نہر حسینی کے خلل پذیر ہونے کی خبر سنی تو اس کی درستی کے لئے خزانہ شاہی سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ بسکہ لکھنؤ بھیجنے کا حکم دیا اور میری التماس سے اس کی نگرانی آپ کے متعلق کی انگریزی حکومت کی وساطت سے یہ رقم آپ کو بھیجی جاتی ہے۔ (ظل ممدود مرتبہ مفتی میر عباس صاحب)

تیس ہزار روپیہ روضۂ حضرت عباسؑ کے نقرئی دروازوں کی تجدید اور ایوان طلا کی تعمیر کے لئے بھیجے یہ روپئے اور خط پہنچنے کے بعد آقا سید ابراہیمؒ نے رسید کا جو خط بھیجا اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:-

ثُمَّ لَاْیَخفَیٰ عَلٰی جَنَابِکُمْ اَنَّ الْمَبْلَغَ الَّذِیْ لَعَطَفَ بِاِجْمَالِہٖ وَتَلَطَّفَ بِاِرْسَالِہٖ وَتَحَمَّلَ بِفَضْلِہٖ تَبْجِیْلَ بَیْرِہٖ وَجُوْدَہٗ وَطَوْلَہٗ المَلِکُ الْاَفْخَمُ وَالسُّلْطَانُ الْاَحْشَمُ الْاَکْرَمُ اَمِیْرُ الْاُمَرَاءِ الْعِظَامِ ظَھِیْرُ الْعُلَمَاءِ الْفِخَامِ حَامِی الشَّرِیْعَۃِ بِالغَرَّاءِ وَنَصِیْرُ الْفِرْقَۃِ الْحَقَّۃِ الْمُحَقَّقَۃِ شِیْعَۃِ الْاَئِمَّۃِ النُّقَبَاءِ عَلَیْھِمُ الْاَلْفُ التَّحِیَّۃُ وَالثَّنَاءُ مَدَّ اللّٰہُ فِی اِطْنَابَ ظِلَالِہٖ عَلٰی مَفَارِقِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَمَّرَ اللّٰہُ بِحُدُوْدِ مُلْکِہٖ الشَّرِیْفِ مَدَارِسَ عُلَمَائِہٖ الْاَطْیَبِیْنَ لِاِصْلَاْحِ مَاانْکَسَرَ مِنْ رَوْضَۃِ مُرَبِّی النَّاسِ اَخِی الْفَضْلِ الْعَبَّاسِ عَلَیْھِمُ السَّلَاْمُ وَالتَّحِیَّۃُ وَھُوَ ثَلٰثُوْنَ اَلْفِ رُوْبِیَۃٍ قَدْ وَصَلَ وَبِمُضِیِّ مُدَّۃٍ اِشْتَعَلَ بِاِصْلَاحِ ذَالِکَ وَالْمَحَلِّ کَمَارَقَمَ السُّلْطَانُ الْاَجَلُّ وَلَعَمْرِ اللّٰہِ لَنِعْمَ مَا فَعَلَ وَحَبَّذَا مَااھْتَدَیٰ فَدَلَّ فَاِنَّہٗ اِسْمٌ یَبْقٰی وَالسِّنِیْنُ وَالْاَعْوَامُ اِلیٰ قِیَامِ الْقِیَامِ لَاْزَالَ فِی تَوْفِیْقِ اللّٰہِ وَعِنَایَتِہٖ مُفْضِی الْمُنٰی بِحِمَایَۃٍ۔ وَقَدْ تَسَلَّمْتُ قَبْضَ وَصُولِ الْمَبْلَغِ الْمَزْبُوْرِ فِی بَغْدَادِ الْمُسَنَّدِ الْاَخْیَارِ الْبَایُوْزِ لَعَلَّہٗ اَرْسَلَ وَوَصَلَ اَیْضًا اَلْمَبْلَغُ الَّذِیْ اَرْسَلْتُمُوْہُ مِنْ بَابِ اللُّطْفِ وَالْاِحْسَانِ لِاَھْلِ الْفِقْہِ وَالْاِیْمَانِ سِیَّمَا الْھِنْدِیِّیْنَ الْفَاطِمِیْنَ فِی ھٰذِہٖ الْمَطَانِ وَھُو ثَلٰثَۃُ الْاٰفِ وَثَلَاثُ مِائَۃٍ وَثَمَانٍ وَسِتُّوْنَ رُوْبِیَّۃً رَائِجَۃَ الْعِرَاقِ فَجَعَلْتُہٗ نِصْفَیْنِ وَرَاْعَیْتُ فِی اَدَائِہٖ عَلَی الْفَرِیْقَیْنِ مَا اُمِرْتُ قَاصِدًا مِنْہُ اِبْرَاءَ ذِمَّتِہٖ ذَالِکَ الْمُؤَیدُ الْمُوَفَّقُ زِیْدَ مَجْدُہٗ وَتَوْفِیْقُہٗ مِنَ الْمُسْتَحِقِّیْنَ سَتَصِلُ اِلیٰ جَنَابِکُمْ مَعَ ھَذِہِ الذَّرِیْعَۃِ فُیُوْضَۃ کَمَا وَصَلَ اِلَیْھِمْ فُیُوْضُہٗ وَالَّذِیْ اَمَرَبِہٖ سُلْطَانُ الْاَعْظَمُ دَامَ اللّٰہُ اِحْسَانَہٗ لِلْمُوْمِنَۃِ الْھِنْدِیَّۃِ الْمُسَمَّاۃِ

سَکِینَۃُ خَانَمْ وَھُوَ ثَمَانُ مِائَۃٍ وَاِثْنَانِ وَاَرْبَعُوْنَ رُوْبِیَۃً بِرَائِجِنَا فَقَدْ وَصَلَ اَیْضاً وَاَصِلُہُ اِلَیْھَا وَسَیَصِلُ اِلَیْکُمْ قَبْضُ الْوُصُوْلِ۔ (ظِلِّ مَمْدُوْدْ)

مخفی نہ رہے جناب پر کہ وہ رقم جو بنظر مرحمت واحسان روانہ کی بادشاہوں کے بادشاہ، علماء کے پشت و پناہ، شریعت غرا کے حامی، فرقۂ شیعہ کے مددگار (خدا ان کا سایہ قائم رکھے) روضۂ حضرت عباسؑ کی شکست و ریخت کی اصلاح کے لئے، وہ تیس ہزار روپے پر مشتمل تھی، وصول ہوئی اور کچھ مدت سے میں حضور بادشاہ کی تحریر کے بموجب اپنی نگرانی میں اس کام کو انجام دلا رہا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ ممدوح نے یہ بہترین خدمت انجام دی ہے جس سے ان کا نام قیامت تک باقی رہے گا۔ میں نے اس کی رسید بغداد میں بالینور کے سپرد کر دی ہے غالباً انھوں نے بھیجی ہوگی نیز وہ رقم جو آپ نے از راہ لطف واحسان فقراء اور اہل ایمان کے لئے عموماً اور ہندوستانیوں کے لئے خصوصاً جو ان اطراف میں مقیم ہیں اور وہ تیس ہزار تین سو اڑسٹھ روپیہ سکّہ رائج الوقت عراق ہیں۔ وہ بھی وصول ہوئے اور میں نے اس کو آپ کی ہدایت کے بموجب ہندوستانیوں اور غیر ہندوستانیوں کے لحاظ سے دو حصوں پر برابر تقسیم کر دیا ہے اور اس کی رسید بھی آپ کو پہنچے گی۔ نیز بادشاہ معظم نے ایک ہندوستانی مومنہ سکینہ خانم کے لئے جو آٹھ سو بیالیس روپئے ہمارے سکے سے روانہ کئے ہیں، وہ بھی پہنچے۔ میں نے ان مومنہ تک اسے پہنچا دیا۔ اس کی رسید بھی آپ کو مل جائے گی۔

سامرہ میں امام حسن عسکریؑ کے روضہ کی چہار دیواری بنوائی اور گنبد پر سونا چڑھوا دیا اور ایک مسافر خانہ فردوس کے نام سے بنوایا۔ حضرت حر کی قبر پر ایک خوبصورت عمارت بنوائی۔

خطّاطی

فن خطاطی نے اس زمانہ میں بڑا عروج حاصل کیا۔ خود ملکہ جہاں (زوجہ محمد علی شاہ) اس فن میں کمال رکھتی تھیں۔ انھوں نے پورا قرآن لکھ کے پندرہ پارے حضرت علیؑ اور پندرہ پارے امام حسینؑ کے روضہ پر چڑھائے۔ جناب سیدہؑ کی سوانح عمری دو ڈھائی سو صفحے کی لکھی۔

سید میرزا اُنسؔ اور جیالال گلشنؔ نے اس میں کمال حاصل کیا۔

شاعری

ناسخ نے اس عہد میں انتقال کیا۔ اب میدان سخن میں صرف آتشؔ تھے اور وہ بھی چراغ سحری۔ دونوں کے شاگرد گروہا گروہ تھے۔ شعر وسخن کا چرچا عام تھا۔

میر ضمیرؔ اور ان کے شاگرد مرزا دبیرؔ کا مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں شہرہ تھا۔ میر انیسؔ فیض آباد میں رہتے تھے، کبھی کبھی لکھنؤ آ کے اپنا سکہ بٹھا جاتے۔

منشی لطف علی نے مومی ضریح بنائی جس کا کام نہایت نازک ہے اور شدید گرمی میں ہزاروں شمعوں کے بیچ کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ ضریح بہت پسند کی گئی اور محمد علی شاہ نے اپنے امام باڑے کو اس سے زینت بخشی۔ حقیقت میں یہ عجیب وغریب ضریح ہے، جس کو دیکھ کے حیرت ہوتی ہے۔ تقریباً بارہ فٹ اونچی ضریح ہر سال تیار ہوتی ہے۔ یہ صنعت اس خاندان میں اب تک محفوظ ہے۔ دوسروں نے نقل کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ شہر کی زینت وآرائش میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ نے لکھا ہے کہ:

شہر کی ترقی

> پھر زینت شہر کا جو خیال ہوا، مزدور ہر ایک مالا مال ہوا۔ دل کشا سے تا درِ سید الشہداؑ کہ حسین آباد میں امام باڑہ بنا ہے۔ ایسی نادر سڑک بنوائی کہ ناظرین آنکھیں بچھاتے ہیں، افسردہ دل بشاش ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت بھی ہزاروں برس زمانے میں یادگار رہے گی، خلق خدا دیکھ کے سبحان اللہ کہے گی۔ شرق سے غرب تک، ہند سے عرب تک اس کا مذکور ہوگا، معمورۂ خراب آباد میں یہ شہر مشہور

ہوگا۔ واہ کیا شستہ ورفتہ ومصفا ہے۔ اگر صفائے عارض خوباں سے مثال دیجئے تو ناروا ہے۔ وہ عارضی ہے، اس کو قیام ہے۔ یا شیشۂ حلب سے نسبت کیجئے، تو بیجا ہے، کہ بقول مشہور وہ شیشۂ باشہ ہے، یہاں استحکام ہے۔ عجب راہ ہے، تنہا چلے جاتے ہیں، دو نظر آتے ہیں، ہمزاد کی صورت کوئی ہمراہ ہے۔ اس قدر شفاف اور مصفا ہے کہ عکس خط استواء صفحہ دنیا پر ہویدا ہے۔ دل گرفتہ اور خاطر فسردہ کو تفریح ہوتی ہے، اس کی سیر حزن وملال کھوتی ہے۔ کیسا ہی خفقان ہو، دور ہو، جگر کو طاقت، دماغ کو فرحت، آنکھوں میں نور، دل کو سرور ہو۔ مریضوں کی دوا ہے، سڑک نہیں بیت الشفا ہے۔ گرمی کی فصل میں سہ پہر کو چار طرف سڑک پر آب پاشی کے باعث فضا ہوتی ہے۔ گرد کسی کے گرد نہیں پھٹکتی، وہ ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہوا ہوتی ہے۔ راہ راست جو سنتے تھے، بدولتِ سلطانِ زماں تنگ نائے وسعت کے سرگشتوں نے پائی۔ باب امید وکامیابی کی سیدھی راہ ہاتھ آئی۔ لولے لنگڑے بے تکلف چلے آتے ہیں۔ اندھے بھی خانۂ مراد تک بے منتِ غیر پہنچ جاتے ہیں۔ دورستہ بازار سڑک پر تیار ہے۔ روم وشام کی اشیاء نادر کا ہر صبح جا بجا انبار ہے۔ اور دکانوں کا وہ ڈھنگ ہے کہ عقلِ رسا دنگ ہے، انداز نیا، جہاں نیا، طرز جُدا جُدا جس سقف وجدار کو دیکھا رنگا رنگ ہے۔ کسی جا چاہِ عمیق مثلِ فکر عقلاء، نخشب کے کنوئیں سے تحفہ۔ کہیں غلہ کا انبار اور پَن چکی ہے۔ گچ کے کام سے آبروئے ریختہ ریختہ، جو شے ہے پکی ہے۔ بازار بے آزار، ہوا سردو سیر ہے، جو وہاں نہ پہنچا اس کی قسمت کا پھیر ہے۔

بابِ امید وکامیابی کا جو پتہ ہے وہ کیا ہے۔ یعنی ادھر تو دردولتِ ابد مدت اور اُدھر حسین آباد کے امام باڑے کی بنا ہے۔ سڑک سے مثال ہلال عید نمایاں ہے۔ جل جلالہٗ کیا شوکت وصولت ہے۔ بُرج طلائی خورشید نمط درخشاں ہے۔ رفعت دالان، شکوہ گنبد مطلا پر مُرغ زرین جناح کنگرۂ چرخ ہر مساء وصباح نثار ہوتا ہے، صدقے گردون دوّار ہوتا ہے۔ شوکت وبلندیٔ سپہر بریں ساکنان زمین کی نظروں سے گر گئی۔ نیر تاباں کے منھ پر خجالت سے زردی پھر گئی۔ دمِ نظارہ یا طوافِ امام باڑہ دیدہ ودل دولتِ کونین حصول کرتا ہے۔ ایسی ہی بنا بانیٔ ارض وسما مقبول کرتا ہے۔ درِ اجابت برائے حاجت منداں وا ہے، ماتم خانۂ شاہ شہداء ہے۔ جس دم ضریح پاک نظر آئی، دل خون، دیدہ جیحون ہوا، چھاتی بھر آئی۔

شیشہ آلات اس قدر ہے کہ حلب والے حسرت سے منھ تکتے ہیں، حیران ہیں۔ جھاڑوں کی یہ کثرت ہے کہ ساکنان فرنگ ہاتھ جھاڑ بیٹھے، سر درگریبان ہیں۔ قندیل بے عدیل سونے چاندی کی ظاہر نگاہ، ہزار در ہزار علمہائے نادر، جن کے دیکھے الم آل عبا ہو۔ خلاصہ یہ کہ امام باڑہ ہو، تو ایسا ہو۔ صحن میں حوض مصفّا، پانی سے ملبّب بھرا، تشنگیٔ اہلبیتؑ کی لہروں سے یاد دلواتا، ڈبڈبائی آنکھ سے کم نہیں۔ کس چیز کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں۔

عیش باغ میں بنائے آصفی موتی جھیل ہے، اس عزاخانے میں بانی جس کا محمد علی شاہ ہوا، یہ نہر رشک کوثر، نمونہ سلسبیل ہے۔ موجوں سے غم خامسِ آلؑ عبا پیدا ہے، چشمۂ فیض چھلک رہا ہے۔ سنگ ریزہ اس کا گوش حور کا آویزہ، فخر دُر یکتا ہے، پانی

پانی اس کے رشک سے دریا ہے۔ مختصر سا اس میں پُل ہے، صناعی میں بالکل پری کی صورت ایک جہاز ہے۔ دمِ رفتار ثابت ہوتا ہے کہ سرگرمِ پرواز ہے۔ نہر کے دونوں طرف مقبرے ایسے رفیع نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والے روضۂ تاج گنج کو بھول جاتے ہیں۔ بسکہ روز مرگ پیش نظر ہے، یہ آرام خانہ تا بہ محشر ہے۔ صحن سبزہ زار ہے، باغ سے زیادہ بہار ہے۔ روشوں پر جانوروں کے گھر عجیب ہیں، طائرانِ غریب ہیں۔

رومی دروازے کی نقل جلو خانے کا وہ نادر تر پولیا ہے، جو حواس خمسہ بشر کھوتا ہے۔ دروں کو دیکھ کے انسان ششدر ہو، جس دم مدّنظر ہو، مقابلے میں رومی دروازہ چشم حیرت کی طرح وا ہے۔ بہ نظر حسرت اُسے تکتا ہے، سہ پہر کو وہاں سیر گزری نظارہ ہر رہ گذری ہے۔ مینا بازار کا جلسہ روز صبح ہوجاتا ہے، ایک جہان لینے دینے کو آتا ہے۔ کسی جا کبوتر گرہ باز، شاہ جہاں پور کے بلند پرواز، کہیں شیرازی گلی نگار، ایک طرف مکھی نیلے، بھورے، سیمابئے، ببرے، بھورے، گنڈے دار۔ کوئی نیم کی پتی ٹکلی یا کوڑی اُچھال کر بیا سے منگواتا ہے، کسی کا یہ دل گردہ ہے کہ بیا سے توپ چھڑواتا ہے، کہیں تو تا بنیٹھی جلتی ہلاتا ہے، صنعت دکھاتا ہے۔ کہیں مینا پھڑک رہی ہے، نیل کنٹھ چھوٹتا ہے، کوئی معقول الگ تماشے کے مزے لوٹتا ہے۔ کہیں بٹیر بازوں کا غول ہے، کہیں لوے تیتر کا مول تول ہے۔

کسی جا ٹینی مرغیاں، کہیں اصیل، کسی طرف انڈے لڑتے، جال میں کوے چیل، خوش رو جوان جھمکڑے کے گھوڑوں پر سوار، ایک سمت فیل نشینوں کی قطار۔ باہم گفتگو ہے کہ یہ مرغ سالار جنگی ہیں، ان میں کوٹھی والوں کا میل ہے، ان کی کھول موند جدا ہے، دانے پانی کا کھیل ہے۔ کہیں اچھوت دلّی والے، ہٹی سنگھ کی زیر بندی، ان کے گلے کھیل لاتوں کے عالم نرالے ہیں۔ کچھ ٹکڑے اور چیتے ہیں۔ مرغ باز ان کے کانٹوں کی بوچھار سے خار کھاتے ہیں، کاری کے خوف سے خونِ جگر پیتے ہیں۔ کسی طرف کا بکیں اور کھانچے ہیں، ٹھاٹھر اور ڈھانچے ہیں، کہیں بربری بکریاں بکتی ہیں، ایک او بوک ہے، خریداروں کے باہم نوک جھوک ہے۔

کسی جا سن رسیدہ عورتیں بُرقع پوش کُرتی، ازار بند، گڑیاں، ہچکیں، لئے موجود، کسی کے روبرو آستین کٹوری، ہتھیلی مسّی سے کبود۔ ایک طرف میوہ فروشوں کی صدا، کہیں سقّوں کے کٹورے کا کھنکنا۔ گرمی کی فصل میں فالودے والے غل مچاتے ہیں، بےفکرے برف کی قلفیاں کھاتے کھلاتے ہیں۔ کسی جگہ کورے گھڑوں میں فرید کی گھاس، گرد اس کے مفلسوں کی ٹھنڈی سانس۔ بانس گڑا، نٹ سر پر گھڑالے کے چڑھا، کوئی سانپ اور نیولا لڑانے کو بڑھا۔

ایک جا قصّہ خوان امیر حمزہ و عمرو کی داستان۔ نقال جدا نیفہ کھونسے مسخرا پن کرتے ہیں۔ ہر ایک پیٹ کے واسطے ظاہرا اپنا اپنا فن کرتے ہیں۔ کہیں لونگ چڑے والے، دال موٹھ کے خوانچوں پر جو بن نرالے۔ ایک طرف مچھلی کے پھڑ پھڑاتے کباب، ان کی ماہیت کے جملے بے حساب، پر سیندور کا رنگ، اور کلیجی کے کباب میں مرچ کا تڑاقا، ترشی کا ڈھنگ۔ طرح طرح کی آبدار

مٹھائی برابر برابر خوانچوں میں رکھی۔ کھٹے چنے پر
مزہ بنے۔ ریوڑی کو منھ لگایا اور پھیر میں آیا، دہن
معطّر ہوا، حلوہ سوہن کا مزا پایا۔ بزازوں کی
دکانیں جُدا، بنارس، ڈھاکہ، چین، گجرات کا ریزا
کم مایہ اپنا بقچہ گٹھری لے کے گزی، گاڑھا، سوسی،
دھوتر کا بیوپار کرتے ہیں۔ دلال اکوائی چھپے،
کٹورے کی تکرار کرتے ہیں۔

صرّافوں کے سامنے اشرفی روپے کا ڈھیر
ہے، بھاؤ کی گفتگو، پرکھوں کا مقابلہ، ہزاروں
لاکھوں کا معاملہ۔ گھن، کلدار، سکہ چیں اور ملتے
میں فرق بڑا۔ زرق برق جوہری بچے گھیر دار جامے
پہنے، پگڑی سر پر، کمر پھولی بندھی، مونگا موتی، الماس،
زمرّد، یاقوت، پکھراج، نیلم لئے آپس میں عجب
طرح کی گھوت سے ٹہلتے ہیں۔ تماشائیوں کے
دل بہلتے ہیں۔ لین دین سے گرم بازاری ہے
گلِ مہندی کا تختہ کھلا، محمد شاہی طرحداری ہے۔
کوئی بیلے کی بہار دیکھ کے ہار چکا تا ہے۔ کوئی
چنبیلی جوہی کی بھینی، بو باس سے بے چین ہوا جاتا
ہے۔ کوئی ککڑ والے کو بلا کے سُلفے کے دم لگاتا
ہے۔ کوئی گانجا چرس کے دھوئیں اُڑاتا ہے۔ غرض
کہ جہاں کا ساز و سامان بدولتِ سلطان عادل مہیا
ہے۔ مصر کا بازار سرد ہو گیا ہے۔ شہر میں امن و امان،
ہر ایک خوش گزران، راست باز، آسودہ، خوش و خرم
ہیں۔ کج رفتار سیدھے ہو جاتے ہیں، ہوش گم ہیں۔
جس کی طینت میں دغابازی، دل میں نطفہ حرامی
ہے۔ اس کا سرکوب نظر ناز امامی ہے۔

وہ جو کارواں سرا نمونۂ سرائے ہستی ہے،
ہموار بہ تزئین بے شمار بلندی ہے، نہ پستی ہے۔
لطف کوچ، مقام کا آرام اُس مقام سے ملتا ہے۔
غنچۂ سربستہ دل دیکھنے سے کھلتا ہے۔ مکانات خوش
قطع، مستحکم خوب، صحن وسیع، شستہ و رُفتہ مرغوب۔

گنبد خانہ اس طرح کا بنا، گویا سبقت فلک
سے لے گیا اور نوکھنڈے کی کرسی غیرت چرخ بریں
ہے، ایسا مکان زیر آسمان بروئے زمین دوسرا
نہیں ہے مسجد رفیع، صحن جس کا وسیع۔

اللہ تعالیٰ اس بنا کے بانی کو تا قیامِ قیامت
قائم رکھے، سایہ اس کا خلق کے سر پر دائم رکھے۔

جلوس کے دن سے جو کام کیا وہ خیر کا،
مکان جو بنایا وہ سیر کا۔ اور کارپرداز بھی خیرخواہ،
جاں فشاں، منہدم بنائے شر، فدیۂ سلطان۔

محمد علی شاہ نے چھ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے حکومت
کی۔ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں انتقال ہو گیا۔ سب کو بے حد
صدمہ ہوا۔ مجتہد العصر مولانا سید محمد صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی
جس میں ریزیڈنٹ بھی شریک ہوئے، تلقین مجتہد العصر کے
چھوٹے بھائی سید العلماء سید حسین صاحب نے پڑھائی۔ جس
وقت انھوں نے پکار کے کہا: اِسمَعْ اِفْهَمْ یَا مُحَمَّدَ عَلِی بنِ
سَعَادَتِ عَلِی تو دنیاوی جاہ و جلال کی بے حقیقی کی تصویر کھنچ گئی۔

امجد علی شاہ ثریّا جاہ

محمد علی شاہ کے بعد ان کے بیٹے امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ
مطابق ۱۸۴۵ء میں پینتالیس/۴۵ برس کے سن میں تخت پر
بیٹھے۔ ان کا مختصر دور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ بڑے متقی،
پرہیزگار اور عابد شب زندہ دار تھے۔ مذہب امامیہ میں حکومت،
امام کا حق ہے اور زمانۂ غیبت میں نائبِ امام یعنی مجتہد کا۔ امجد علی
شاہ نے مالک تخت و تاج کے ہونے کے بعد سید محمد صاحب مجتہد
العصر کی خدمت میں تخت و تاج پیش کیا۔ انھوں نے ان کو اپنا
نائب مقرر کر کے ان کی حکومت کو شرعاً جائز کر دیا۔ ایران میں
سلاطین صفویہ بھی یہی کرتے تھے۔

انھیں مجتہد العصر سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کے گھر پر

ملنے جایا کرتے تھے نام لینا بے ادبی سمجھتے تھے۔ بڑے قبلہ وکعبہ اور ان کے چھوٹے بھائی سید حسین صاحب مجتہد العصر کو چھوٹے قبلہ وکعبہ کہتے تھے۔ نام لینے کی ممانعت تھی اور یہ خطاب دیا تھا:

مجمعِ علومِ دین، مرجعِ سادات ومومنین، حافظِ احکامِ الٰہ، موردِ اعتقاداتِ حضرت امجد علی شاہ، سلطانُ العلماء قبلہ وکعبہ مجتہدُ العصر مولانا سید محمد صاحب ابن المرحوم مولانا سید دلدار علی غفران مآب۔

ان کے چھوٹے بھائی سید حسین عرف میرن صاحب کو یہ خطاب دیا تھا:

حاویِ علومِ دین، حامیِ سادات ومومنین، حافظِ احکامِ الٰہ، مورد عنایات حضرت امجد علی شاہ، سیدُ العلماء مجتہدُ العصر مولوی سید حسین ابن المرحوم سید دلدار علی غفران مآب علیہ الرحمہ

مجتہد کو قبلہ وکعبہ، سب سے پہلے امجد علی شاہ نے کہا۔ سلطان العلماء اور سید العلماء کی زندگی تک کوئی اور قبلہ وکعبہ نہیں کہا گیا۔ ان کے انتقال کے بہت دنوں کے بعد عام ہوا۔[۱]

امجد علی شاہ نے سلطان العلماء سے حکومت میں اصلاحات کی خواہش کی جس سے وہ بالکل شرعی ہوجائے۔ انھوں نے محکمۂ شرعیہ کی تجویز پیش کی، جس کے ذمہ عدلیہ، فوجداری، آبکاری، امور خیر اور منہیات پر پابندی تھی۔ یہ تجویز منظور ہوئی اور انھیں کی نگرانی میں محکمۂ شرعیہ قائم ہوا اور حکومت کی بالادستی اس پر نہ رہی۔ دیوانی ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد باقر کے سپرد ہوئی۔ منصف الدولہ شریف الملک خطاب ہوا۔ فوجداری ان کے دوسرے بیٹے محمد مرتضٰی کے سپرد ہوئی، خطاب خلاصۃ العلماء ہوا۔ قتل وقصاص وآبکاری خود سلطان العلماء نے اپنے پاس رکھی۔

نجم الغنی رام پوری لکھتے ہیں کہ شہر سے پانچ کوس تک کہیں شراب کا نام نہ تھا۔ دواً بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی تھی۔ اس زمانے کے مشہور ظریف شاعر میاں مشیرؔ نے شعر کہا ؎

شراب جو نہ پیئے آج کل وہ ناری ہے
جناب قبلہ وکعبہ کو آب کاری ہے[۱]

عدلیہ سلطان العلماء کے دوسرے بیٹے سید مرتضٰی صاحب کے سپرد ہوا اور خلاصۃ العلماء خطاب ملا۔ قضاء وافتاء سلطان العلماء کے بھتیجے (سید مہدی صاحب کے بیٹے) سید ہادی صاحب کے سپرد ہوا اور عمدۃ العلماء خطاب عنایت ہوا۔

ہر نظامت پر قاضی مقرر ہوئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اودھ میں شیعہ، مفتی وقاضی مقرر ہوئے۔ علمائے فرنگی محل قضا وافتاء کی مسند پر بحال رہے۔ جو اہل سنت کے مقدمات اپنی فقہ کے فیصلے کی رو سے کرتے تھے۔ صرف اب وہ خاندانِ اجتہاد کی ماتحتی میں آگئے۔ ہندوؤں کے لئے بھی فاضل برہمن قاضی کے عہدے پر سرفراز کئے گئے۔ ہم نے پرانے کاغذات میں مفتی دیاشنکر کا نام دیکھا تھا۔

زکوٰۃ کا محکمہ سید العلماء کے چھوٹے صاحب زادے سید علی نقی صاحب کے سپرد ہوا زبدۃ العلماء معین المومنین خطاب دیا گیا۔

خزانہ پر زکوٰۃ عائد ہوئی۔ زبدۃ العلماء تقسیم زکوٰۃ میں بہت

---

[۱] غالب نے اپنے بعض خطوط میں سرفراز حسین اور ان کے چھوٹے بھائی میرن صاحب کو لکھا ہے اللہ اللہ اب تو تم پانی پت کے سلطان العلماء مجتہد العصر ہوگئے۔ کہو تم کو وہاں کے لوگ قبلہ وکعبہ کہنے لگے یا نہیں یہ انھیں دونوں بزرگوں کی طرف اشارہ ہے چونکہ آگے بہت سے نام آنے والے ہیں۔ ان کی وضاحت کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ غفران مآبؒ کے پانچ بیٹے تھے۔ اس ترتیب سے محمد، علی، حسن، مہدی، حسین۔ سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے بیٹے نے عظیم شہرت حاصل کی۔ بڑے بیٹے سید محمد یہی اودھ کی تاریخ میں سلطان العلماء بڑے قبلہ وکعبہ مجتہد العصر، رضوان مآب اور چھوٹے بیٹے سید حسین سید العلماء چھوٹے قبلہ وکعبہ علیین مکان ہیں۔

[۱] یہ قدیم ترکیب ہے فلاں کو کوتوالی ہے۔ اب کوکی جگہ کی بولتے ہیں۔

محتاط تھے۔ متدّین آدمیوں کو رکھا۔ اور مزید احتیاط سے ایسا نظام تقسیم قائم کیا کہ زکوٰۃ لینے والے کو بارہ جگہ نام لکھوانا پڑتا تھا۔ اس پر کسی نے جل کے کہا ؎

سید نقی کا ظلم وجفا وامصیبتا
بارہ مصدی ایک گلا وامصیبتا

اہم مقدمات کا فیصلہ سلطان العلماء نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ صاحب تذکرۂ بے بہافی تاریخ العلماء نے لکھا ہے کہ امجد علی شاہ نے کسی تاجر سے زر و جواہر نگار مسند تکیہ تیرہ لاکھ روپیہ کا خریدا۔ عملے نے سات لاکھ دبا لیا۔ وہ بہت دن تک دوڑتا پھرا۔ آخر محکمۂ شرعیہ میں دعویٰ دائر کیا۔ بادشاہ کو جواب دہی کا حکم ہوا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی اور بادشاہ کے خلاف فیصلہ ہوا تاجر کو روپیہ کی ادائی ہوئی۔ حکومت کے عدل وانصاف کی دھوم مچ گئی۔ اس سے متاثر ہو کر مرزا دبیرؔ نے ایک مرثیہ میں بادشاہ کی تعریف کی۔ یہ دفترِ ماتم جلدِ اوّل کا پہلا مرثیہ ہے مطلع یہ ہے ؎

طغریٰ نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے

چند بند ملاحظہ ہوں ؎

خار جفا سے راستوں کو صاف کردیا
نوشیرواں کو قائل انصاف کردیا
بس عین عدل قاف سے تا قاف کردیا
دنیائے دوں کو تابع اشراف کردیا
چہرہ ستم کا ہے نظری اہل دید میں
اب ظلم چھپ کے بیٹھا ہے قبر یزید میں

۞

ہر شب ہے روز عید عجب روزگار ہے
انصاف سربلند ہے کیا تاجدار ہے
اقبال یارِ شہر ہے کیا شہر یار ہے
اس لطف پر یہ رحمت پروردگار ہے
عالم وہ ہیں کہ قدرت رب آشکار ہے
ہاتھوں سے جن کے مذہب حق پائدار ہے

۞

اوّل جناب مجتہد العصر والزماں
بسم اللہ صحیفۂ آیاتِ عزوشاں
خضر زمانہ مرجعِ سادات ومومناں
سلطان عالماں، سند معنی وبیاں
چشم وچراغِ مجلس عالم جمال میں
خاص الخلاصۂ بنی آدم کمال میں

۞

بابش علی وختم رسل جد امجد است
اسمش جناب حضرت سید محمد است
درراستی چو حرف نخستینِ ابجد است
بالا نشینِ منبر و ایوان ومسند است
ایمن شد است شہرز طور جمال او
اے من فدائے نور چراغ کمال او

۞

ناجی وہی ہے ان سے جسے اعتقاد ہے
وہ اعتقاد شیعوں کو زاد المعاد ہے
ارشاد وہ بجا ہے کہ اللہ شاد ہے
خیر الجہاد ان کے لئے اجتہاد ہے
شیعوں کو کہئے قبلہ شناس اس بیان سے
کہتے ہیں ان کو قبلہ وکعبہ زبان سے

۞

بعد ان کے سید العلماء مجمع علوم
خاصان ذوالجلال میں کالبدر فی النجوم
اک طبع پاک اور شغل نیک کا ہجوم
اس پر بھی ہے وفور نوازش علی العموم
دنیا کے فخر دین کے بھی زیب وزین ہیں
وجہ حسن یہ ہے کہ سمی حسین ہیں

۞

معنئ حلم ولفظ حیا، آیۂ کرم
تقویٰ وزہد وعدل وورع سر سے تا قدم
انصاف کھا رہا ہے مرے قول پر قسم
مطلوب داد نظم ہے، نے شہرۂ رقم
واقف ہے کبریا کہ دروغ وریا نہیں
مطلب کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں

۞

اس کے بعد تقریباً سولہ بند اور ہیں:

طوائفوں کو حکم ہوا ہے کہ وہ توبہ کرکے صالح مردوں سے نکاح کر ڈالیں۔ ہجڑوں اور زنانوں کو شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ شرعی قوانین نافذ ہوئے، جن میں تعزیرات بھی شامل تھیں۔

ائمہ اہلبیتؑ کی ولادت ووفات کی تعطیلیں معین ہوئیں۔

مدرسۂ سلطانی قائم ہوا۔ اس کے صدر مدرس سید العلماء کے بڑے صاحب زادے سید محمد تقی صاحب مجتہد العصر بنائے گئے اور ممتاز العلماء فخر المدرسین خطاب ہوا ان کی ماتحتی میں مولانا حامد حسین صاحب (مصنف عبقات)، مفتی میر عباس صاحب، مولانا احمد علی صاحب محمد آبادی، مولانا الشیخ علی اظہر ایسے یکتائے روزگار مدرسی پر معین ہوئے۔ اس کا افتتاح خود بادشاہ نے ایک پُرتکلف دعوت میں کیا۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ مرحوم نے تجلیات میں لکھا ہے کہ:

۲؍جمادی الاول ۱۲۵۹ھ جناب سلطان العلماء سید العلماء مع اولاد واصحاب شہر کے تمام فضلاء اور طلباء کو لے کر مہمانی سلطانی میں تشریف فرما ہوئے دیر تک بادشاہ سے باتیں رہیں آخر میں انعام واکرام سلطانی پر فائز ہوئے۔ یہ دعوت بہت پُرتکلف تھی۔

مفتی میر عباس نے اس کے افتتاح کی جو تاریخ کہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ امین الدولہ امداد حسین خان وزیر اعظم کی توجہ دہانی سے قائم ہوا۔

کرد تحریک درآں امرِ حسن شام وسحر
پیش نواب فلک رتبہ وزیر اعظم
شد بنا مدرسۂ تازہ بامداد حسین
پس ہمیں مصرع تاریخ رقم کرد قلم

سید العلماء کی تحریک سے نجف میں نہر حسینی نکالی گئی۔ حضرت مسلم وہانی کی قبر مطہر پر عمارت نہ تھی۔ مسجد کوفہ خستہ ہوگئی تھی اور کوئی مینار نہ تھا۔ ان سب کے لئے ایک کثیر رقم شیخ محمد حسین نجفی صاحب جواہر الکلام کو سید العلماء کی وساطت سے بھیجی۔ انھوں نے جب ان کی تعمیر شروع کی تو اپنے شاگرد اور باکمال شاعر شیخ ابراہیم قطفان آل یحییٰ العاملی سے ایک قصیدہ کہلوایا، جو بادشاہ، سلطان العلماء، سید العلماء کی مدح اور نہر وعمارت کی خصوصیات پر مشتمل تھا۔ قصیدہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

اِنَّ سُلْطَانَ السَّلَاطِیْنِ الْوَرٰی
فَخْرَ اَرْبَابِ الْمَعَالِی وَالدُّوَلِ
ذُوْ النُّهٰی اَمْجَدُ عَلِی شَاهَ الَّذِیْ
مُنِحَ التَّاجَ وَبِالْمُلْکِ اسْتَقَلَّ
اَصْلُ کَمْ مِنْ مَلِکٍ سَامِی الذُّرٰی
فِیْ کَمِیْ ظِلِّ مَعَالِیْهِ اسْتَظَلَّ
وَمَلِیْکُ دِیْنِ آلِ الْمُصْطَفٰی
عَزَّ فِیْ اَیَّامِهٖ وَالْکُفْرُ ذَلَّ
وَاَعَزُّ لَاْحَ فِی اَفْلَاکِهٖ
کَوْکَبًا فَضْلٍ بَدَا مِنْ غَیْرِ کَلَّ
مَوْلَانَا الْمَوْلَوِیَّانِ وَمِنْ
کُلِّ فَضَلٍ حَرِیًا مِنْ غَیْرِ کَلَّ
اَوْرَدَاهُ مَنْهَلَ الْعِلْمِ الَّذِیْ
شَرْبًا مِنْ عَذْبِهٖ لَهْلًا وَعَلَّ
فَجَرٰی جَرْیًا اِلَیْهِ فِی الْعَسَلِ
وَالْحَیَا مَنْ فَیْضِ کَفِّهٖ سَهَلَ

رَمَقَ الدُّنْیَا فَلَمَّا اَنْ رَاٰی
رَوْاَحَ الْفَضْلِ بِکُوْفَانِ اُضْمَحَلَ
بَذَلَ الْاَمْوَاْلَ لِلّٰهِ وَمَا
رَاْحَ اِلَّا وَهُوَ فِیْ مَنْ بَذَلَ
حَطَّ نَهَرًا بَیْنَ اَکْنَافِ الْحِمٰی
فَاِنَّ بِالْبُشْرٰی لذبد مَنْ نَهِلَ
کَوْثَرفِیْ جَنَّةٍ جَلَّ بِهَا
حَیْدَرُ سَادَاْتِ الْمِلَلِ
وَسَبِیْلٌ وَاضِحٌ لِلْخَیْرِ بَلْ
سَلْسَبِیْلُ غَلَلِ الصَّادِین بَلَّ
مَا اهْتَدیٰ یَوْمًا لَهٗ خَطُّ امْرِیءٍ
غَیْرَ سُلْطَاْنٍ اِذَا قَاْلَ فَعَلَ
اَیُّ نَهْرٍ عَمَّ نَفْعاً بِالْحِمٰی
وَحَمَاْ مَنْ فِیْهِ وَاْرُ تَحَلَ
مَاْ مَنْ کُوْفَانِ الْغَاطَالِمَا
کَانَ هَذَفًا لِکُلِّ حَوْفٍ وَحِلُ
کَمْ هُمَاْمٍ رُمَاْمٍ ذَالصُّنْعِ وَمَاْ
مَدَّبَاْحَاْ نَحْرِهٖ حَتّٰی نَکَلَ
مَاْنَثْنِیْ عَنْ نَیْلٍ مُرْتَدِیَا
حَلَّ الْعَجْزَ وایه اَوِ الْکَسَلَ
هٰکَذَا فَلِعَمَلِ الْعَامِلِ لَوْ
فَلْیَقِفْ مِنْ دُوْنِ غَایَاتِ الْعَمَلِ
شَادَ مِنْ اَرْکَانِ اَعْلَامِ الْهُدٰی
وَعَامَاتِ الْمَعَالِی مَا نَنْزَلَ
وَبَنٰی فِی الْکُوْفَةِ الْعِزَامَا
طَاْلَ فَخْرًا وَعَلٰی لَشَعْرِی اَطَلَّ
حَضْرَةُ الْقُدْسِ الَّتِیْ فِی ممنها
مُسْلِمْ بَلْ مروحته الْاِسْلَاْمِ حَصْلٰی
نَاصِرُ الْسِبْطِ وَرَافِیْهِ وَمَنْ
کَاْنَ لَهٗ حَامًا لَاْ یَغْسَلُ
وَاسْتَنَارَ الْاُفُقُ مِنْ مَاذَنَتِهٖ
قَدْ تَسَامَتْ وَبِهَا الْحُسْنُ الْکُمَلُ
کَبَّرَ الذِّکْرَ فِیهَا وَاحِدًا
اَحَدًا فَرْدًا کَبِیْرًا یَزِلُ
وَعَذَا یَلْهَجُ فِی تَارِیخِهَا
عَلَنًا حَیَّ عَلٰی خَیْرِالْعَمَلِ
۰ ۶ ۲ ۱ ھ

(منقول از ظل ممدود مرتبۂ مفتی میر محمد عباسؒ)

بادشاہ بادشاہان خلق، فخر ارباب بلندی دولت دانش مند امجد علی شاہ جنہیں قدرت نے تاج عطا کیا اور مستقل سلطنت کے مالک ہوئے۔

ایسے بلند مرتبہ کہ نہیں معلوم کتنے بلند درجہ بادشاہ ان کے سایہ اقبال میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ ایسے بادشاہ جن کے زمانہ میں دینِ نبیؐ نے عزت پائی اور کفر ذلیل ہوا۔

ایسے روشن چہرے والے کہ جن کے آسمان میں دو ستارے علم وعمل کے چمکے۔ ہمارے مولاؤ آقا دونوں آقایانِ کرام جنہوں نے ہر فضیلت کو بغیر کسی مشقت کے حاصل کیا انھوں نے بادشاہ کو پہنچا دیا علم کے اس گھاٹ پر جس کے شیریں پانی سے وہ خود بارہا سیراب ہو چکے تھے۔

ان کا فیض بلندی میں جاری ہوا اور چشمے ان کے دست کرم سے اُبل پڑے انھوں نے دنیا کی طرف نظر ڈالی اور جب دیکھا کہ فضیلت وشرف کا محل کوفہ میں کمزور ہو گیا ہے

تو انھوں نے خدا کی خوشنودی کے لئے اموال صرف کئے اور ہر شخص سے زیادہ سخی ثابت ہوئے انھوں نے بنیاد قائم کی ایک نہر کی نجف کے اطراف میں جو سیراب کرنے کی ضامن ہے وہ ایک کوثر ہے۔ اس جنت میں جہاں قیام کئے ہوئے ہیں امیر المومنین، سید السادات خلق اور وہ ایک واضح راستہ ہے جو

پیاسوں کی پیاس بجھانے والا ہے۔

یہ ایسی خدمت کی جو کسی کو نہ سوجھی سوائے اس بادشاہ کے جو اپنی بات پر عمل کرنے والا۔ کیا کہنا اس ہنر کا جس کا نفع اس شہر میں عام ہو گیا ہے اس نے حفاظت کی حاضر و مسافر کی جان کی۔

اس نے محفوظ رکھ لیا کوفہ کے ایسے محل کا جو خوف کا مرکز تھا۔

کتنے بلند مرتبہ لوگ ایسے تھے جنھوں نے اس کے بنوانے کا ارادہ کیا۔ اور ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہی قدم پیچھے ہٹا لیا عاجزی کی چادریں اوڑھ کے۔

بے شک اس طرح کام کرنا چاہئے کام کرنے والے کو، نہیں تو ہوس ہی نہ کرے۔

انھوں نے مضبوط کیا ہدایت کے ارکان کو اور رفعت کے ستونوں کو جو نیچے گر گیا تھا۔

اور بنیاد قائم کی کوفہ میں اس عمارت کی جو فخر میں ستارہائے فلک سے بلند ہے وہ مقدس بارگاہ جس میں حضرت مسلم دفن ہیں بلکہ اسلام کا دل بلکہ سبط پیغمبر کا مددگار وہ جو دین کے لئے نہ کند ہونے والی تلوار تھا۔

اور اُفق آسمان روشن ہو گیا۔ ایسے مینار سے جو بلند ہوا اور اس سے حسن کامل ہو گیا اس میں مؤذن عظمت کا اظہار کرتا ہے اس واحد کی جو فرد ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ اور وہ اس کی تاریخ میں کہتا ہے "عَلَنًا حَيَّ عَلٰى خَيْرِ الْعَمَلِ" ۱۲۶۰ھ

(منقول از ظل ممدود مرتبہ مفتی میر عباس صاحب)

سید العلماء سے انھوں نے ۱۲۶۰ھ میں فارسی میں علم کلام کی ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی انھوں نے "حدیقۂ سلطانیہ" کے نام سے وہ معرکہ آرا کتاب پانچ جلدوں میں لکھی جس کا مثل و نظیر نہیں ہے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا سید علی صاحب سے اردو میں "تفسیر قرآن" لکھوائی یہ آٹھ جلدوں میں مطبع شاہی سے شائع ہوئی۔

غفران مآبؒ کے تیسرے بیٹے مولانا سید حسن نے اردو میں اصول دین کی ایک کتاب باقیات الصالحات لکھی۔ سلطان العلماء کے بڑے بیٹے محمد باقر منصف الدولہ نے علم کلام میں "تشیید مبانی الایمان" فارسی میں لکھی اس زمانہ میں علمائے فریقین کی اتنی کثرت تھی جن کا شمار ممکن نہیں۔ حدیث و تفسیر و کلام و مناظرہ و فلسفہ و منطق میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔

احمد حسین سحرؔ نے تذکرہ "بہار بے خزاں" اور سعادت ناصر خان ناصرؔ نے "خوش معرکہ زیبا" لکھا۔ اس دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ نصیر الدین حیدر نے جو رسد خانہ میجر ہر برڈ کی نگرانی میں قائم کیا تھا اور اس وقت تک حکومت کے بیس پچیس لاکھ روپیہ اس پر صرف ہو چکے تھے۔ میجر موصوف کی محنت سے ایک نادر کتاب تیار ہوئی۔ اس کی اشاعت کے لئے سات ہزار روپیہ خزانہ سے منظور ہوا۔ اسی اثنا میں ہر برڈ کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ کام کرنل ولکاکس کے سپرد ہوا۔ رزیڈنٹ کو ان سے دشمنی تھی۔ انھیں یہ گوارہ نہیں ہوا کہ ایسے عظیم الشان کام میں ولکاکس کی شرکت ہو۔ انھوں نے ایسی ترکیبیں کیں کہ تمام سرمایہ تلف ہو گیا، لاکھوں کا نقصان ہوا اور حکومت کا وہ کارنامہ جو رہتی دنیا تک سلاطین اودھ کا نام روشن رکھتا اور دنیا اس سے فیض حاصل کرتی، برباد ہو گیا۔

شہر کی رونق میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے سعادت علی خان کے بسائے ہوئے شہر میں ایک نیا محلہ حضرت گنج آباد کیا۔ یہ لکھنؤ کا سب سے زیادہ بارونق بازار ہے۔ شام کے وقت یورپ کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ برصغیر میں ایسا پرفضا اور شاندار بازار میں نے نہیں دیکھا۔

کشمیر میں راجہ نے مسلمانوں پر ظلم کیا۔ امجد علی شاہ نے ان کو ترک وطن کر کے لکھنو چلے آنے کا پیغام بھیجا۔ سینکڑوں خاندان وہاں سے چلے آئے۔ بہت سے مقبرہ جناب عالیہ کے مکانات واقع گولا گنج میں آباد کئے گئے۔ ان کی نسلیں آج بھی وہاں آباد ہیں۔ ایک کثیر تعداد کو منصور نگر اور کاظمین کی طرف بسایا گیا اور کشمیری محلہ آباد ہوا۔

لکھنؤ سے کانپور تک پختہ سڑک بنوائی۔ غازی الدین حیدر

نے انگلستان سے ایک لوہے کا پل منگوایا تھا۔مختلف زمانوں میں اس پر کچھ کچھ کام ہوا مگر اتمام تک نہ پہنچ سکا۔امجد علی شاہ کی توجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچا۔

امین الدولہ نے امین آباد بسایا۔ منصف الدولہ خلف سلطان العلماء نے روضۂ امام حسینؓ کی نقل بنوائی جو دیانت الدولہ کی کربلا کے نام سے مشہور ہے۔عاشورہ کے دن شہر کے تعزیئے وہیں دفن ہوتے ہیں۔

شرف الدولہ نے روضہ کاظمین کی نقل تعمیر کرائی۔

بادشاہ کے زہد وورع اور تقدس کا یہ اثر تھا کہ سارا شہر عبادت گذار بن گیا۔ہاتھ میں تسبیح وضع میں داخل ہوگئی۔چند روز کے لئے آنے والا بھی مذہب کے سانچے میں ڈھل جاتا تھا۔نماز روزہ کے ساتھ تعزیہ داری بہترین کار ثواب سمجھی جاتی تھی۔ ہر شخص مجلس وماتم اور تعزیہ داری کرتا تھا۔ ہندو بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔اب تک ہندوؤں کا تعزیہ عاشور وچہلم کو لکھنؤ میں اٹھتا ہے۔

سپہ گری یہاں کی قدیم وضع تھی لائف آف این ایسٹرن کنگ کا مصنف لکھتا ہے:

بازاروں میں سب سے نرالی بات یہ ہے کہ لوگ مسلح رہتے ہیں۔یہ بات کہیں اور نہیں پائی جاتی۔۔۔گلیوں میں ایک ادنیٰ سی بات پر تلوار چل جاتی ہے۔جب اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوتی ہے تو لڑنے والوں کے شوروغل سے دور تک خبر پہنچ جاتی ہے ۔۔۔اکثر اوقات بہت سخت خونریزی ہوجایا کرتی ہے۔ یہی حالت اس وقت تھی جب میں ۱۸۳۵ء میں لکھنؤ میں تھا اور اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کی یہی حالت ہے۔ایک یورپین سیاح کو۔۔۔لکھنؤ کے بھک منگوں کی یہ ادا ضرور متحیر کردے گی جس قدر مرد فقیر ہیں سب ہتھیار بند ہیں ۔۔۔یہ فقیر ڈھال تلوار سے مسلح ہوتے ہیں۔۔۔میں نے ایک نامی فقیر کا نام سنا ہے جس کے پاس ایک ہاتھی بھی تھا اور وہ اسی پر سوار ہوکے روزانہ شہر کا چکر لگاتا تھا''

ہندو مسلمان سب شاعری کے دلدادہ تھے۔معمولی طبقہ کے لوگ بھی شاعر اور سخن فہم تھے۔ سعادت ناصر خاں تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں لکھتے ہیں کہ:

''قادر علی مجرمؔ اگر چہ دلاّل بازار جُفت فروشاں ہے لیکن اس کے قالب طبع میں شعر خوب ڈھلتے ہیں۔''

نظر علی تیلی بھی شاعر تھا۔

میر انیسؔ اس زمانہ میں فیض آباد سے مستقل طور پر لکھنؤ چلے آئے اب مرزا دبیرؔ اور میر انیس مدمقابل تھے سارا شہر دو گروہوں میں بٹ گیا تھا،انیسئے اور دبیریئے۔

عہد امجد علی شاہ میں شیعیت کا عروج اور خاندان اجتہاد

دور امجد علی شاہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس عہد میں خاندان اجتہاد کو بہت عروج حاصل ہوا۔

مفتی محمد عباس صاحب سلطان العلماء سید محمد صاحب کے متعلق فرماتے ہیں ان کی سربلندی سے دین الٰہی سربلند ہوا اور بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ وقت نے ان کے آگے سر عقیدت خم کردیا اور شاہی اقتدار کا ایک حصہ ان کو سونپ دیا۔ انھوں نے اسلامی آئین نافذ کیا اور بہت سے دینی کام کئے جس کا دائرہ عراق تک پھیلا۔مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس کے یہ اسباب ہیں۔

اس وقت اس خاندان میں علماء کی کثرت،ایسی کتابوں کی تصنیف جس سے دین میں روح تازہ دوڑ گئی۔اعلیٰ روحانیت، سیرت وکردار کی بلندی، بادشاہوں کی طرف رخ نہ کرنا اور حق پر قائم رہنے میں ان کی مخالفت کرنا۔ ان باتوں نے ان کا وقار بہت بلند کردیا عام لوگ ان کے گرویدہ ہوگئے۔بادشاہ دین دار تھے۔انھوں نے بھی عقیدت کا سر جھکا دیا۔ان باتوں کو ہم مختصر طور پر پیش کرتے ہیں کہ آپ عروج کا اصل راز سمجھ لیں۔

علماء کی کثرت

اس وقت اس گھرانے میں چودہ متبحر عالم موجود تھے۔

(۱)سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب، (۲)مفسر

قرآن مولانا سید علی صاحب، (۳) فقیہ اہلبیتؑ مولانا سید حسن صاحب، (۴) سید العلماء مولانا سید حسین صاحب پسران غفران مآبؒ، (۵) صفوۃ العلماء منصف الدولہ شریف الملک مولانا محمد باقر صاحب، (۶) خلاصۃ العلماء مولانا سید محمد مرتضٰی صاحب، (۷) مولانا محمد صادق صاحب، (۸) مولانا سید عبداللہ صاحب، (۹) ملک العلماء مولانا بندہ حسین صاحب، (۱۰) مولانا سید علی اکبر صاحب پسران سلطان العلماء، (۱۱) عمدۃ العلماء مولانا سید محمد ہادی صاحب نبیرۂ غفران مآبؒ، (۱۲) زین العلماء عضد الدین مولانا علی حسین صاحب، (۱۳) ممتاز العلماء فخر المدرسین مولانا محمد تقی صاحب، (۱۴) زبدۃ العلماء مولانا علی نقی صاحب پسران سید العلماء سید حسین صاحب وغیرھم۔

اتنے عالموں کا وجود ایک گھر میں دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتا۔ اور ان کے لئے بے شمار شاگرد جوان لوگوں کو اپنا روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی ان کے مربی وسرپرست تھے، علم کے ساتھ معاش بھی مہیا کرتے تھے۔ قیام کے لئے مکان دیتے تھے اور دینی کتابیں لکھنے [۱] کی فرمائش کرتے تھے۔ اس وقت کے علماء میں کوئی ایسا نہیں جو دینی کتابوں کا مصنف نہ ہو۔

غفران مآبؒ کے وقت سے سارے ہندوستان کے شیعہ لکھنؤ کو اپنا دینی مرکز سمجھتے تھے۔ علم دین حاصل کرنے والے یہیں آتے تھے۔ یہیں کے علماء باہر بلائے جاتے تھے۔ اس وقت ان باتوں میں ترقی ہوئی اور ایک نئی بات یہ ہوئی کہ یہاں کی دینی کتابیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں جن میں بچوں کے پڑھنے کی کتابیں بھی تھیں اور اوسط و اعلیٰ استعداد کے لوگوں کے لئے بھی تھیں۔ ان میں ''بارقہ ضیغمیہ''، ''ضربت حیدریہ''، ''بوارق موبقہ''، ''طعن الرماح'' سلطان العلماء نے ایسی کتابیں لکھیں جن کا مثل نہیں ہے ان کی خصوصیت یہ ہے کہ قرآن وحدیث سے استدلال کے ساتھ عقلی اور فلسفیانہ استدلال اتنے مضبوط ہیں جو ذہن انسانی کی معراج ہیں۔ ان کتابوں نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ علماء کہتے ہیں کہ یہ عقل انسانی سے بالاتر ہیں۔ غفران مآبؒ کی کتابیں بھی اس میں شامل ہیں۔

مفتی محمد عباس صاحب فرماتے ہیں:

> ''ان کی علمی جلالت کا اندازہ ان کی تصنیفوں سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے شریعت محمد مصطفیؐ کی مدد کی۔ ان کی وجہ سے اس کی تجدید ہوئی۔ وہ حکمت الٰہیہ جاننے والوں کے مقتدا اور مجتہدین کے نقطۂ آخر ہیں۔'' (اوراق الذہب)

مولانا میر حامد حسین صاحب لکھتے ہیں:

> ''علمائے متکلمین میں سب سے افضل، فقہائے مجتہدین میں سب سے اکمل، سارے اور تمام مومنین کے مولاء وآقا، وقت کے فرد، خدا کی تائید ان کے ساتھ ہے۔'' (رسالہ تقیہ)

عراق کے مشہور عالم حجۃ الاسلام مولانا علی نقی طباطبائی ان کی کتابوں سے متاثر ہو کے لکھتے ہیں:

> ''دائرہ عقل کے مرکز، آسمان علم کے قطب، ارباب فضل کے راس، واعظین زمانہ میں یکتا اور وحید۔ (ظلم ممدود)

[۱] ایک دلچسپ واقعہ سے غفران مآبؒ نے مفتی محمد قلی صاحب کو تحفہ اثنا عشریہ کے ایک باب کی رد لکھنے کی فرمائش کی اور اس کا خاکہ بتایا اور کچھ کتابیں دیں۔ کچھ لکھ کے لائے اور کچھ کتابیں اور مانگیں غفران مآب نے فرمایا عاریتی کتاب کا فائدہ عارضی ہوتا ہے اہل علم کو کتاب اپنے پاس رکھنا چاہئے وہ محصل کی معلم اور مصنف کا آلہ ہیں جیسے حداد ونجار بغیر اوزار کے کچھ نہیں کر سکتے اسی طرح مصنف کتابوں کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا اور دو روپئے ان کو دیئے کہ اس سے کتاب خرید کے کتب خانہ قائم کیجئے۔ انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر دو روپیہ لئے ایک روپیہ کی ایک کتاب خرید کے کتب خانہ کا افتتاح کیا اور ایک روپیہ برکت کے لئے صندوقچہ میں رکھا جو برکت کے روپیہ کے نام سے ان کے خاندان میں برسوں رہا اس نے کیا برکت دکھائی یہ تو نہیں معلوم مگر اس ایک روپیہ کی کتاب کی یہ برکت ہوئی کہ وہ کتب خانہ عظیم الشان بن گیا اور آج تک موجود ہے۔

حجۃ الاسلام سید علی حائری مصنف ضوابط الاصول فرماتے ہیں:

''ملک اسلام کے قطب، دائرہ عزت واحترام کے نقطہ بدر تمام، احکام شرعیہ کا دارومدار ان کی ذات پر ہے، مسائل حکمیہ کو انھوں نے زندہ کردیا اور علم وکمال میں روح پھونک دی شریعت کی بنیادوں کو قائم کیا اور ہدایت کے راستوں میں چراغ روشن کردیئے'' (ظل ممدود)

شیخ الفقہاء شیخ محمد حسن نجفی مصنف جواہر الکلام فرماتے ہیں:

''ایسے علامہ جن کا نظیر نہیں، معقول ومنقول، فروع واصول جن کی ذات میں جمع ہیں، فقہاء ومجتہدین کے فخر، اسلام کے مددگار، عراق وایران وہندوستان کے مومنین کے آقائے اعظم'' (ظل ممدود)

ان بیانات سے ان کتابوں کی عظمت کا اندازہ کیجئے۔

روحانیت

روح کی بالیدگی عبد ومعبود کے راز ونیاز پر ہے جس کو عبادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نماز، وظائف، مناجات اسی کی شکلیں ہیں، لیکن اس کی روح خضوع وخشوع ہے۔ ازبر الفاظ جاری کرلینا کوئی خیر نہیں، سلطان العلماء اور سید العلماء کی عبادت خضوع وخشوع کا اعلیٰ معیار تھی۔

مولانا سید محمد حسین تذکرہ بے بہا فی تاریخ العلماء میں لکھتے ہیں:

بعض فضلائے اہل سنت جب شیعہ ہوگئے اور ان کی خدمت میں حاضر رہنے لگے، آپ کے حالات دیکھتے تو حیران ہوکے کہتے کہ آپ طاعت وعبادت میں مثل علیؑ بن ابی طالب کے ہیں۔

صاحب تاریخ العلماء لکھتے ہیں:

ایک بزرگ زائرائمہ اطہار فرماتے ہیں کہ آپ کو اور علماء سے وہی نسبت ہے جو بشر کو فرشتہ سے ہے زائرین کا قول ہے کہ اگر کوئی بلاد وامصار کی سیر کرے اور علماء کی صحبت میں رہے تو آپ کی قدر معلوم ہو۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

اگر آپ عہد رسول میں ہوتے تو آپ کے فضائل میں کوئی آیت ضرور اُترتی اور ابوذر وسلمان پر آپ کو فضیلت دیتے، آپ کے تمام افعال وعادات عبادت تھے۔

یہ مفتی میر عباس صاحب کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ وہ اوراق الذہب میں لکھتے ہیں:

لَوْ کَانَ فِی زَمَنِ جَدِّہٖ رَسُوْلِ الْاِنْسِ لَیَنْزِلُ اللّٰہُ فِیْ مَدْحِہٖ شَیْئًا مِنَ الْقُرْآنِ وَ اَفْضَلَہٗ عَلٰی اَبِیْ ذَرٍّ وَ سَلْمَانَ۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ فرماتے ہیں:

خدا نے ان کے چہرہ میں حسن، کلام میں نمک اور الفاظ میں فصاحت عطا کی ہے۔ ان کی صحبتیں مثبت ہیں، جہاں لغو اور غیر مشروع باتوں کا گذر نہیں۔ ان کی عادت میں حسن اخلاق ومزاح ہے، مگر کوئی شخص ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا۔ ان میں سختی ونرمی ہے جو خدا نے عطا کی ہیں ان میں، تن تنہا قیام وقعود میں وہ بہت ہیں جو بادشاہوں کو فوج ولشکر کے ساتھ میسر نہیں۔ وہ جناب باوجود قوت قلب کے رحم دل اور بندوں پر مہربان ہیں۔ شجاعت میں شیر اُن کے سامنے سے فرار کرتا ہے۔ موعظہ کے وقت پتھر اگر احساس کرے تو ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے بالخصوص جب

وہ جناب منبر پر موت اور قبر کا تذکرہ کرتے اور ابر بارندہ کی طرح روتے ہیں خدا کے راستہ میں کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ خدا کی رضا کے طالب رہتے ہیں۔

حق پر استقامت

غفران مآبؒ کے بعد ساری ذمہ داری سلطان العلماء پر آپڑی۔ ان لوگوں نے کبھی امراء وسلاطین کی طرف رُخ نہیں کیا۔ بس اتنا ربط رکھا کہ نکاح کے لئے بلایا تو چلے گئے۔ نماز جنازہ، نماز جماعت پڑھادی، مسجد میں بادشاہ کے آگے اور وہاں سے نکل کے بادشاہ کے پیچھے نہیں ہوئے۔ اس روش نے غازی الدین حیدر کے زمانہ میں ایک حادثہ سے دوچار کردیا۔

اودھ کی تاریخوں میں تو صرف اتنا لکھا ہے غازی الدین حیدر اپنے بیٹے نصیرالدین حیدر سے خفا ہوگئے اور اپنے نواسے محسن الدولہ کو اپنا جانشین بنانا چاہا، مگر کتب سیر میں ہے کہ انھوں نے محضر بنا رکھا، جس میں نصیرالدین حیدر کی ابنیت سے انکار تھا۔ سب نے بادشاہ کے خوف سے دستخط کردیئے۔ جب سلطان العلماء کے پاس آیا تو انھوں نے اس پر لکھا **ازم عمل غیر صالح** اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بادشاہ یہ عمل غیر صالح ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نصیرالدین عمل غیر صالح کی ابنیت سے انکار نہیں ان کا یہ فعل مزاج شاہی پر گراں گذرا اور زندگی بھر ناراض رہے۔

غازی الدین حیدر کے بعد نصیرالدین حیدر تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

سلطان العلماء کی بڑی آؤ بھگت کی ولی عہدی کے زمانے سے اپنی طرف مائل سمجھ کے۔ مگر تخت پر بیٹھتے ہی ان سے ٹکر ہوگئی ایک عورت سے (جسے اس کا شوہر چھوڑ چکا تھا مگر شرعی طور پر طلاق نہیں ہوا تھا) نکاح پڑھنے کے لئے طلب کیا۔ انھوں نے صاف کہہ دیا کہ شوہر اوّل سے افتراق شرعی طور پر ثابت نہیں اس لئے میں نکاح نہیں پڑھوں گا۔ بادشاہ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور آپ "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ" کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

حضور شاہی میں یہ جرأت اور زیادہ برہمی کا باعث ہوئی۔

اس کے بعد شراب کے جواز کا فتویٰ اس صورت سے چاہا کہ طبیب حاذق نے بادشاہ کی زندگی کا انحصار شراب پینے میں تجویز کیا ہے، اس صورت میں حکم شرع کیا ہے؟ سلطان العلماء جانتے تھے کہ اس بہانے سے شراب نوشی مقصود ہے۔ جس طرح جان بوجھ کے طبیب حاذق کی غلط تجویز ہے، اُسی طرح مفتی کا فتویٰ غلط ہوگا۔ مگر صورت مسئلہ میں طبیب حاذق کی رائے سے مخالفت کی گنجائش مفتی کو نہ تھی۔ انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے کام لیا اور لکھ دیا "لَاشِفَاءَ فِی الْحَرَامِ" ان سے پہلے کسی نے اس محل پر اس حدیث کو پیش نہیں کیا تھا۔ نصیرالدین حیدر کی تندمزاجی مشہور ہے۔ یہ دوسری جھڑپ تھی۔ اب رعب شاہی سے کام لینا چاہا اور ایک مسئلہ پوچھنے کے بہانے سے بلوایا۔ ایک کرسی پر خود بیٹھے اور ایک پر قلم دان رکھ دیا اور ارادہ کیا کہ جب سلطان العلماء آئیں گے تو تعظیم نہ کروں گا، مگر جب وہ دروازے کے پاس پہنچے، تو عربی قاعدے سے بلند آواز میں یااللہ کہا اور اندر داخل ہوگئے۔ بے اختیار بادشاہ تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے اور وہ قلم دان اُٹھا کے بیٹھ گئے۔ بادشاہ دیر تک سناٹے میں رہے۔ آخر میں پوچھا کہ اسلام سے پہلے اگر جسم میں نجاست لگ جاتی تو اس جگہ کو کاٹ دیتے تھے۔ فرمایا خون نجس نہ ہوگا۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ مصاحبین خاص نے پوچھا تو کہا جب وہ کمرے میں آئے معلوم ہوا کسی نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھڑا کردیا مفتی میر عباس صاحب نے "اوراق الذہب" میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے چہرے میں تنہا وہ رعب وجلال ہے جو بادشاہوں کو لشکروں کے ساتھ نصیب نہ تھا۔ اس واقعہ سے سلطان العلماء سمجھ گئے کہ بادشاہ کو مخالفت پیدا ہوگئی ہے اور وہ توہین پر آمادہ ہیں۔ دوسری دفعہ جب بلائے گئے تو جانے سے انکار کردیا۔ نصیرالدین حیدر اس کی تاب کہاں لاسکتے تھے آگ بگولا ہوگئے۔ حکم دیا کہ ان کا مکان توپ سے اُڑا دیا جائے شہر میں ہل چل مچ گئی۔ رات کو یہ حکم ہوا تھا کہ بجلی

کی طرح سارے شہر میں خبر دوڑ گئی۔ امرائے دربار دوڑے آئے کہ سلطان العلماء معافی مانگ لیں۔ انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ رات لوگوں نے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوئی شاہی فوج کے کپتان مقبول الدولہ نے توپ خانے سے دو توپیں نکلوائیں۔ ایک سلطان العلماء کے مکان پر چڑھ گئی۔ دوسری محل سرائے شاہی پر۔ بادشاہ کی آنکھ کھلی، معلوم ہوا شاہی محل پر توپ چڑھ گئی، حواس جاتے رہے۔ پوچھا یہ توپ کیوں اور کس نے چڑھائی ہے؟ معلوم ہوا کہ شاہی فوج کے کپتان نے۔ وہ کہتے ہیں میری غیرت قبول نہیں کرتی کہ بادشاہ دین کا مکان توپ سے اُڑادوں اور بادشاہ دنیا کا محل کھڑا رہے۔ اس لئے میں اپنی دین و دنیا دونوں آج ختم کئے دیتا ہوں۔ احساس مذہبی نے بادشاہ کو چونکا دیا، نشہ اُتر چکا تھا شرمندہ ہوئے۔ کپتان کو ان کے جوش ایمانی پر گراں بہا خلعت عنایت کیا، مگر سلطان العلماء سے زندگی بھر صفائی نہ رہی۔ مگر مذہبی امور کی انجام دہی انھیں کے ہاتھوں ہوتی رہی۔ (تاریخ العلماء)

نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ انھوں نے جامع مسجد بنوائی اور سلطان العلماء سے نماز پڑھانے کی استدعا کی۔ انھوں نے کہا اس میں کچھ زمین نعیم خان کی شامل ہوگئی ہے، اس لئے میں نماز نہیں پڑھاؤں گا یہ بادشاہ نہایت متدین اور بیدار مغز تھے، انھوں نے سلطان العلماء ہی کے سپرد اس کی تحقیقات کی اور کہا کہ شرعی حیثیت سے جواز کی صورت آپ نکال دیں۔ انھوں نے نعیم خان کو بلوا کے زمین کے معاوضے پر راضی کرلیا اور بادشاہ سے معاوضہ دلوا کے نماز پڑھائی۔

امجد علی تو ان کے معتقد تھے ان سے کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ واجد علی شاہ کے زمانہ میں ہنومان گڑھی کے واقعہ میں تمام علماء اہل سنت حکومت کے موافق اور سلطان العلماء حکومت کے خلاف ہوئے۔

نجم الغنی نے تاریخ اودھ میں لکھا ہے کہ ہنومان گڑھی کے واقعہ میں علمائے اہل سنت نے بادشاہ کے موافق اور سلطان العلماء نے بادشاہ کے خلاف فتویٰ دیا۔ انھوں نے اپنے علماء کو گالیاں لکھ کر دیواروں پر چسپاں کیں اور اپنی نماز پڑھ کے شیعوں کی مسجد میں آ کے سلطان العلماء کا موعظہ سنتے تھے۔

غدر میں باغیوں کے سردار احمد اللہ شاہ جو ''ڈنکا شاہ'' کے نام سے مشہور تھے، سلطان العلماء کے پاس آئے اور کہا کہ انگریزوں سے جہاد کا فتویٰ دیجئے۔ انھوں نے کڑے تیور ڈال کر کہا علماء فرنگی محل سے فتویٰ لیجئے۔ ہمارے یہاں غیبت امام میں جہاد نہیں۔

غدر کے بعد ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا۔ مگر ان کے اعزاز کا اتنا لحاظ کیا کہ گرفتار نہیں کیا اور گھر پر مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ وکیل نے پوچھا کہ نویں محرم کو بیلی گارڈ پر حملہ کا حکم آپ نے دیا تھا؟ فرمایا غیبت امام میں ہمارے یہاں جہاد جائز نہیں۔ اس نے کہا اگر امام آجائیں اور آپ سے کہیں کہ انگریزوں کا قتل عام شروع کرو تو آپ قتل کرنا شروع کر دیں گے۔ فرمایا ان کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ بھی ہوں گے۔ انگریزوں نے بغاوت سے ان کو بری کر دیا۔ جائیداد واپس کر دی اور دو ہزار روپیہ ماہوار ان کے لئے پنشن مقرر ہوگئی۔

ملکہ وکٹوریہ نے حکومتِ ہند کو لکھا کہ کیسے شخص ہیں جو کسی سے نہیں ڈرتے، ہم ان کی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں۔ حکومت نے ان کی تصویر بنوا کے ہاتھی دانت کے چوکھٹے میں بھیجی۔ ایک تصویر رزیڈنسی میں تھی جو بعد کو عجائب خانہ میں رکھی۔ اس کی نقل جو لوگوں کے پاس اور اس کتاب میں ہے۔

سیرت و کردار کی اس بلندی نے ایک دنیا کو ان کا معتقد بنا رکھا تھا امجد علی شاہ مذہبی آدمی تھے انھوں نے سرِ عقیدت خم کر دیا اور اپنے اقتدار کا ایک حصہ ان کو سونپ دیا اور بقول راجہ درگا پرشاد دنیا پر ان کا حکم جاری ہوگیا اور اس سے دینی فوائد ہوئے۔

ذرۂ ناچیز

یکم جنوری ۱۹۹۴ء — محمد باقر شمس

✿✿✿